خدا تعالیٰ کون ہے؟

کتاب العقائد

تصنیف

حضرت اِمام غزالی رحمتہ اللہ علیہ

مگر عقل سے ہماری مراد بھی یہی عین الیقین اور نور ایمان ہے' یعنی وہ باطنی صفت جس سے انسان چوپایوں سے ممتاز ہوتا ہے اور حقائق کے ادراک کی قوت حاصل کرتا ہے' اس طرح کے مغالطے دراصل ان لوگوں کی جہالت سے پیدا ہوتے ہیں جو حقائق کو الفاظ کے آئینے میں دیکھتے ہیں' کیوں کہ الفاظ میں اختلافات ہیں' اس لیے حقائق بھی مختلف سمجھ لیے جاتے ہیں۔ عقل کے بیان میں یہ تفصیل بہت کافی معلوم ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت اور مہربانی سے "کتاب العلم" مکمل ہوئی۔ اب "کتاب العقائد" شروع ہوتی ہے۔ انشاءاللہ۔

"والحمدللہ اولاً و آخراً و صلے اللہ علی سیدنا محمد و علی کل عبد مصطفی من اھل الارض والسماء۔

پہلا باب

کتابُ العقائد

عقائد کا بیان

کلمۂ شہادت کے بارے میں اہل سنّت کا عقیدہ : اس باب میں کلمۂ طیبہ یعنی "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کے بارے میں اہل سنّت کے عقیدہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے یہ کلمہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن ہے' اس کا پہلا جملہ توحید پر مشتمل ہے' اور دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر۔ اس لیے ان دونوں کی تفصیل الگ الگ بیان کی جارہی ہے۔ پہلا جملہ توحید پر مشتمل ہے۔ توحید کا تقاضا ہے کہ ان امور کا اعتقاد کیا جائے۔

وحدانیت : یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں اکیلا ہے' کوئی اس کا شریک نہیں' یکتا ہے' کوئی اس جیسا نہیں' بے نیاز ہے' کوئی اس کا حریف نہیں' نرالا ہے کوئی اس کی نظیر نہیں' ایک ہے' قدیم اور ازلی ہے' اسکی کوئی ابتدا نہیں' ہمیشہ رہنے والا ہے' اس کی کوئی انتہا نہیں' قیوم ہے' اس کا انقطاع نہیں' دائم ہے جس کو کبھی فنا نہیں' عظمت اور جلال کے اوصاف سے متصف ہے' اور متصف رہے گا' زمانوں کے گذرنے' اور ماہ و سال کے ختم سے بھی وہ ختم نہیں ہوگا' وہی اوّل ہے' وہی آخر ہے' وہی ظاہر ہے' وہی باطن ہے۔

تنزیہ : یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ نہ صورت دار جسم رکھتا ہے' نہ وہ محدود ذی مقدار جوہر ہے' نہ وہ عرض ہے' نہ اس میں کوئی عرض حلول کئے ہوئے ہے بلکہ نہ وہ کسی موجود کے مشابہ ہے اور نہ کوئی موجود اس کے مشابہ ہے' نہ وہ کسی جیسا ہے اور نہ اس جیسا کوئی ہے۔ نہ وہ کسی مقدار میں محدود ہے اور نہ جہتیں اسے گھیرے ہوئے ہیں' نہ آسمان و زمین اس کو محیط ہیں' وہ عرش پر اس طرح ہے جس طرح اس نے کہا' یا جس طرح اس نے ارادہ کیا' یعنی وہ عرش کو چھونے' اس پر جمنے' یا اس میں حلول کرنے سے پاک ہے۔ عرش اس کو نہیں اٹھاتا بلکہ عرش اور حاملینِ عرش' سب کو اسکی قدرت نے اٹھا رکھا ہے اور سب کے سب اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہ عرش سے' آسمان سے' زمین کی ہر چیز سے اوپر ہے۔ اس کی فوقیت اس طرح کی ہے کہ وہ نہ عرش اور آسمان کے قریب ہے' اور زمین سے دور' بلکہ وہ عرش اور آسمان سے بلند تر ہے' اسی طرح وہ زمین سے بلند تر ہے' لیکن اس کے باوجود وہ ہر موجود چیز سے قریب ہے' اور بندہ کی شہ رگ سے بھی قریب تر ہے' موجود کے پاس اس کی قربت اجسام کی قربت سے مشابہ نہیں' جس طرح کہ اس کی ذات اجسام کی ذات سے مشابہ نہیں۔ نہ وہ کسی چیز میں حلول کرتا ہے اور نہ کوئی چیز اس میں حلول کرتی ہے' وہ اس سے بلند تر ہے کہ کوئی مکان اس کا محیط ہو' اسی طرح وہ اس سے پاک ہے کہ کوئی اسکا احاطہ کرسکے' وہ زمان و مکان کی تخلیق

سے پہلے موجود تھا اور اب بھی ایسا ہی ہے جیسا پہلا تھا۔ وہ اپنی صفات میں مخلوق سے جدا ہے' نہ اس کی ذات میں اس کے سوا دوسرا ہے' اور نہ کسی دوسرے میں اس کی ذات ہے' وہ تبدیلی اور تغیر سے پاک ہے' نہ حوادث اس پر نازل ہوتے ہیں اور نہ عوارض طاری ہوتے ہیں' بلکہ ہمیشہ ہمیش وہ زوال و فنا سے پاک رہے گا' اپنی صفاتِ کمال میں اس کو کسی اضافے کی ضرورت نہیں جس سے اسکا کمال پورا ہو' اسکا وجود عقلوں کے ذریعہ معلوم ہے' جنت میں نیک لوگوں پہ اس کا یہ انعام ہو گا کہ وہ انھیں اپنے دیدار کے شرف سے نوازے گا۔

حیات اور قدرت : یہ اعتقاد کرے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے' قادر ہے' جبّار و قاہر ہے' نہ اس پر عجز طاری ہوتا ہے اور نہ اس سے کوتاہی واقع ہوتی ہے۔ نہ اسے نیند آتی ہے اور نہ اونگھ' نہ اس کے لیے فنا ہے اور نہ اسے موت واقع ہوتی ہے وہ ملک اور ملکوت والا ہے' وہ صاحب عزّت و جبروت ہے' اسی کے لئے سلطنت' اقتدار' خلق اور امر ہیں۔ آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہیں' اور تمام مخلوقات اس کی مٹھی میں ہیں' تخلیق میں وہ منفرد ہے' ایجاد و ابداع میں اس کا کوئی ثانی نہیں اس نے مخلوق کو پیدا کیا' ان کے اعمال کی تخلیق کی' ان کے رزق متعیّن کئے' اور موت کا وقت مقرر فرمایا۔ کوئی چیز اس کے دستِ قدرت سے باہر نہیں ہے' نہ اس کی قدرت کے تغیّرات باہر ہیں' نہ اسکی زیرِ قدرت چیزوں کا شمار ممکن ہے' اور نہ اس کی معلومات کی انتہا معلوم ہے

علم : یعنی یہ جاننا کہ خدا تعالیٰ تمام معلومات کا علم رکھتا ہے' زمین کی تہوں سے لے کر آسمان کے اوپر تک جو کچھ ہے اس کا علم سب کو محیط ہے' آسمان و زمین میں کوئی ذرّہ بھی اس کے دائرہ علم سے خارج نہیں' بلکہ وہ سیاہ رات میں سخت پتھر پر رینگنے والی سیاہ چیونٹی کے رینگنے' اور ہوا کے درمیان ذرّہ کے اڑنے کا بھی علم رکھتا ہے' ہر پوشیدہ اور ظاہر بات اس کے علم میں ہے' دلوں کے حالات' خیالات' اور باطن کے مخفی اسرار جانتا ہے' اس کا علم قدیم ہے' ازلی ہے' وہ ہمیشہ سے اس علم کے ساتھ متّصف رہا ہے۔ ایسا نہیں کہ یہ علم اس کی ذات میں حلول و انتقال سے نیا پیدا ہوا ہے۔

ارادہ : یعنی یہ اعتقاد کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق ارادے سے کی ہے' اور تمام پیدا شدہ چیزوں کا انتظام وہی کرتا ہے' ملک اور ملکوت میں جو کچھ ہے' تھوڑا ہے یا بہت' چھوٹا ہے یا بڑا' خیر ہے یا شر' نفع ہے یا نقصان' ایمان ہے یا کفر' معرفت ہے یا جہالت' کامیابی ہے یا محرومی' طاعت ہے یا معصیت۔ سب اسی کے حکم' تقدیر' حکمت اور خواہش سے ہیں۔ اس نے جس چیز کو چاہا وہ ہوئی اور جس کو نہ چاہا وہ نہیں ہوئی۔ پلک جھپکنا' دل میں کسی خیال کا پیدا ہونا اس کی خواہش سے باہر نہیں بلکہ وہی شروع کرنے والا وہی لوٹانے والا ہے۔ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے کوئی اس کا حکم رد کرنیوالا نہیں اور نہ کوئی اس کے فیصلے کو منسوخ کرنے والا ہے۔ گناہوں سے بچنا اس کی توفیق اور مدد کے بغیر ممکن نہیں اور نہ اس کی اطاعت اس کی خواہش اور اس کے ارادے کے بغیر ممکن ہے' اگر دنیا بھر کے لوگ' جن' فرشتے' اور شیطان اور متفقہ طور پر دنیا میں کسی ذرّہ کو اس کے ارادے اور خواہش کے بغیر حرکت و سکون دینا چاہیں تو یہ خارج از امکان ہے اس کا ارادہ اس کی تمام دوسری صفتوں کے ساتھ اس کی ذات سے قائم ہے' اور وہ ہمیشہ سے ان اوصاف کے ساتھ متّصف رہا ہے' اور ہمیشہ رہے گا' اس نے ازل ہی میں اشیاء کے وجود کا ارادہ کیا' اور ان کا وقت مقرر فرمایا' چنانچہ اس کے ارادے کے مطابق اپنے اپنے وقت پر کسی تقدیم و تاخیر کے بغیر ہی چیز وجود پذیر ہوئی' بلکہ اس کے ارادے کے مطابق کسی تبدیلی یا تغیّر کے بغیر واقع ہوئی' اس نے امور عالم کا وہ نظم کیا کہ نہ اس میں افکار و مقدّمات کی ترتیب کی ضرورت پیش آئی' نہ کچھ دیر کا انتظار کرنا پڑا' اسے ایک حالت دوسری حالت سے غافل نہیں کرتی۔

سننا اور دیکھنا : یعنی یہ اعتقاد کرنا کہ اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر ہے' سنتا ہے' دیکھتا ہے' کوئی سننے کی چیز کتنی ہی آہستہ کیوں نہ کہی گئی ہو یا دیکھنے کی چیز کتنی ہی باریک کیوں نہ ہو اس کے سننے اور دیکھنے سے بچ نہیں سکتی۔ نہ دوری اس کے سننے کی راہ میں رکاوٹ ہے' نہ تاریکی دیکھنے میں مانع ہے۔ وہ دیکھتا ہے مگر چشم و ابرو سے پاک ہے' سنتا ہے مگر کانوں اور کانوں کے سوراخوں سے منزہ ہے' جیسے علم

میں دل سے، پکڑنے میں عضو سے، پیدا کرنے میں آلہ سے پاک ہے۔ جس طرح اس کی ذاتِ پاک مخلوق کی ذات کی طرح نہیں اس طرح اس کی صفات بھی مخلوق کی صفات کے مشابہ نہیں۔

کلام : یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کلام کرنیوالا ہے اور اپنے ازلی، قدیم کلام سے جو اسکی ذات کے ساتھ قائم ہے حکم دیتا ہے، منع کرتا ہے، وعدہ کرتا ہے اور ڈراتا ہے، اس کا کلام مخلوق کے کلام کی طرح نہیں کہ ہوا کے ذریعہ اجرام کے ٹکراؤ سے، زبان کی تحریک اور ہونٹوں کے آپس میں ملنے سے آواز پیدا ہوتی ہو۔ بلکہ ان سب سے جداگانہ ہے، قرآن، توراۃ، زبور اور انجیل اس کی کتابیں ہیں جو اس کے پیغمبروں پر نازل ہوئیں۔ قرآن کریم کی تلاوت زبانوں سے ہوتی ہے اوراق پر لکھا جاتا ہے، دلوں میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود وہ قدیم ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کیساتھ قائم ہے، اس سے جدا ہو کر دلوں میں یا اوراق پر منتقل نہیں ہو سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا کلام آواز اور حروف کے بغیر سنا تھا جس طرح کہ نیک لوگ آخرت میں اللہ تعالیٰ کو جوہر عرض کے بغیر دیکھیں گے۔

افعال : یہ عقیدہ رکھنا کہ جو چیز موجود ہے وہ اسی کے فعل سے حادث ہے، اسی کے عدل سے مستفید ہے، اس کا وجود بہتر، اتم، اکمل اور اعدل طریقے پر ظہور پذیر ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں حکیم اور اپنے احکام میں عادل ہیں، اس کے عدل کو بندوں کے عدل پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ بندہ سے ظلم کا امکان ہے اس طرح پر کہ وہ غیر کے ملک میں تصرّف کرے، اللہ تعالیٰ سے ظلم ممکن نہیں، کیونکہ اس کو غیر کی ملک ملتی نہیں ہے کہ وہ اس میں تصرّف کر کے ظالم کہلائے، جو کچھ اس کے سوا ہے انسان، جن فرشتے، شیطان، زمین، آسمان، حیوانات، سبزہ، جماد، جوہر، عرض، مدرک اور محسوس سب حادث ہیں۔ اس نے اپنی قدرت سے ان چیزوں کو عدم سے وجود عطا کیا، ازل میں تنہا تھا۔ کوئی دوسرا اس کے ساتھ نہ تھا، اپنی قدرت کے اظہار اور اپنے ارادہ کی تکمیل کے لئے اس نے مخلوق کو پیدا کیا۔ اس لیے نہیں کہ اسے مخلوق کی ضرورت تھی، یا وہ ان کی تخلیق کا محتاج تھا، خلق، اختراع، تکلیف (مکلّف بنانے میں) انعام اور اصلاح میں اپنے فضل و کرم سے کام لیتا ہے، کوئی چیز اس پر واجب نہیں ہے، فضل، احسان، نعمت اور انعام سب اسی کے لئے ہیں، وہ اس پر قادر تھا کہ وہ اپنے بندوں کو عذاب دیتا اور انھیں طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ بھی اس کا عدل ہوتا نہ کہ ظلم ــــــ اللہ تعالیٰ نے اپنے مؤمن بندوں کو ان کی طاعات پر اپنے کرم اور وعدہ کے مطابق ثواب عطا کرتا ہے۔ نہ بندہ اس ثواب کا مستحق ہے اور نہ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ اسے اجر و ثواب سے نوازے، اس لیے کہ اس پر کسی کے لیے کوئی فعل واجب نہیں ہے، نہ اس سے ظلم ممکن ہے، اور نہ کسی کا اس پر حق واجب ہے، بلکہ مخلوق پر اس کا حق واجب ہے، کہ اس کے احکام کی تعمیل کرے، یہ حق اس نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ واجب کیا ہے، محض عقل سے واجب نہیں کیا۔ رسولوں کو دنیا میں بھیجا، معجزوں کے ذریعہ ان کی صداقت ظاہر فرمائی۔ انھوں نے اس کے اوامر، نواہی، اس کے وعدے اور وعید مخلوق تک پہنچائے اسی لیے یہ بھی ضروری ہوا کہ لوگ اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کو سچا جانیں، اور جو کچھ وہ لے کر آئے ہیں اسے تسلیم کریں۔

اب کلمۂ طیبہ کے دوسرے جملے کی تفصیل سنئے، خدا کی وحدانیت کے اقرار کے ساتھ ساتھ یہ اعتقاد بھی کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اُمّی قرشی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب و عجم، جنّ و انس کی طرف اپنا رسول بنا کر بھیجا۔ ان کی شریعت سے تمام سابقہ شریعتوں کو ان احکام کے علاوہ جنہیں اس نے باقی رکھا منسوخ قرار دیا۔ آپ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی اور تمام انسانوں کا سردار بنایا۔ ایمان کامل کے لیے لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کو کافی نہیں سمجھا بلکہ رسول کی شہادت بھی ضروری قرار دی۔ دنیا اور آخرت سے متعلق جن امور کی خبر آپ نے دی ان کی تصدیق واجب قرار دی۔ کسی بندہ کا ایمان اس وقت تک قبول نہیں کیا جاتا جب تک کہ وہ مرنے کے بعد کے حالات پر جن کی خبر آپ نے دی ہے ایمان نہ لائے۔ مرنے کے بعد بعض حالات یہ ہیں جن پر ایمان لانا

ضروری ہے۔

بندہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ منکر نکیر کی تصدیق کرے۔ یہ دونوں ہولناک اور مہیب صورت کے دو شخص ہیں جو بندے کو قبر میں روح اور جسم کے ساتھ سیدھا بٹھلاتے ہیں اور اس سے توحید و رسالت کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ تیرے نبی کون ہیں؟ (*)

یہ دونوں قبر میں امتحان لینے والے ہیں۔ (۱) مرنے کے بعد اوّلین آزمائش منکرین کا سوال ہے۔ (۲) قبر کے عذاب پر ایمان لائے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ عذابِ قبر حکمت اور انصاف کے ساتھ جسم روح دونوں پر جس طرح خدا کی مرضی ہوگی ہوگا۔ (۳) میزان پر ایمان لائے کہ اس کے دو پلڑے ہیں۔ بیچ میں ایک زُبانہ ہوگا۔ اس کے پلڑے اتنے بڑے ہوں گے جتنے آسمان و زمین کے طبقات ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اعمال تولے جائیں گے۔ باٹ اس دن ذرّہ اور رائی برابر ہوں گے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہوں۔ نیکیوں کے صحیفے نور کے پلڑے میں ڈالے جائیں گے۔ نیکیوں کے درجات جس قدر بارگاہِ خداوندی میں بلند ہوں گے اسی قدر ترازو بھاری ہوگی اور برائیوں کے صحیفے تاریک پلڑے میں ڈالے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے عدل کے باعث ترازو ان سے ہلکی ہوجائے گی۔ (۴) پل صراط پر ایمان لائے کہ دوزخ کی پشت پر ایک پل تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک بنا ہوا ہے جس پر سب کا گذر ہوگا۔ خدا تعالیٰ کے حکم سے کافروں کے پاؤں اس پل پر پھسلیں گے اور وہ دوزخ میں گر جائیں گے اور ایمان والوں کے پاؤں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس پر جمے رہیں گے اور وہ دارُالقرار میں داخل کردیئے جائیں گے۔ (۵)

حوض پر ایمان لائے جس پر مؤمنین گذریں گے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حوض ہے۔ اہلِ ایمان اس کا پانی جنّت میں داخل ہونے سے پہلے اور پل صراط سے اترنے کے بعد پئیں گے۔ (۶) جو شخص اس حوض کا ایک گھونٹ پانی پی لے گا وہ کبھی پیاسا نہیں ہوگا۔ اس حوض کی چوڑائی ایک ماہ کی مسافت کے بقدر ہے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے میٹھا ہے۔ اس کے چاروں طرف رکھے ہوئے پیالے یا پانی کے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہوں گے۔ (۷) اس حوض میں دو پرنالے جنّت

(*) عن ابی هریرة ! اذا قبر المیت او قال : احدکم اتاه ملکان اسودان ازرقان یقال لاحدهما المنکر وللآخر النکیر (ترمذی ابن حبان) عن انس : ان العبد اذا وضع فی قبره و تولی عنه اصحابه و انه لیسمع قرع نعالهم اتاه ملکان فیقعدانه (بخاری و مسلم)

(۱) عن عبدالله ابن عمرو: و انهما فتانا القبر (احمد و ابن حبان) (۲) ان سوالهما اول فتنة بعد الموت (یہ حدیث نہیں ملی)

(۳) عن عائشة انکم تفتنون او تعذبون فی قبورکم (بخاری و مسلم) عن ابی هریرة و عائشة استعاذته صلی الله علیه وسلم من عذاب القبر (بخاری و مسلم) (۴) عن عمر : قال الایمان ان تومن بالله و ملائکته و کتبه و رسله و تومن بالجنة والنار والمیزان ذی الکفتین واللسان و صفته فی العظم انه مثل طباق السموات والارض (بیہقی) یہ حدیث مسلم شریف میں بھی ہے لیکن اس میں میزان کا تذکرہ نہیں ہے۔ ابوداؤد میں عائشہؓ کی حدیث ہے لیکن اس میں میزان کے ہلکے یا بھاری ہونے کا تذکرہ نہیں ہے۔ ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں حضرت عائشہؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔ "ای جی قد علمنا الموازین هی الکفتان فیوضع فی هذه الشئی ویوضع فی هذه الشئی فیرجح احداهما و تخف الاخری۔" (۵) عن ابی هریرة وهو (الصراط) ممدود علی متن جهنم احد من السیف و ادق من الشعر (بخاری و مسلم) عن ابی سعید ! ثم یضرب الجسر علی جهنم (بخاری و مسلم) زاد مسلم : قال ابو سعید ! ان الجسر ادق من الشعر و احد من السیف۔ مسند احمد ابن حنبل میں یہ قول بروایت عائشہ مرفوع بھی نقل ہوا ہے۔

(۶) حوض پر ایمان لانے اور اہل ایمان کا حوض سے پانی پینے کے متعلق حدیثیں مسلم میں انسؓ سے مروی ہے۔ یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "انا اعطیناک الکوثر" کے نزول کے موقع پر ارشاد فرمائی۔ حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں : "وهو حوض ترد علیه امتی یوم القیامة آنیته عدد النجوم (۷) عن عبدالله ابن عمر : من شرب منه شربة لم یظمأ بعدها ابدًا عرضه میسرة شهر اشد بیاضا من اللبن واحلی من العسل حوله اباریق عدد نجوم السماء (بخاری و مسلم)

کے چشمۂ کوثر سے گرتے ہیں۔(٭) حساب پر ایمان لائے۔ لوگ حساب کے معاملے میں مختلف ہوں گے۔ بعض لوگوں سے سخت حساب لیا جائے گا، بعض لوگوں سے چشم پوشی کی جائے گی اور بعض لوگ بے حساب جنّت میں داخل ہوں گے۔

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہوں گے۔(۱) اللہ تعالیٰ انبیاء میں سے جس سے چاہے یہ پوچھ لے گا کہ تم نے تبلیغ رسالت کی ذمہ داری ادا کی یا نہیں؟ کافروں میں جس سے چاہے انبیاء کی تکذیب کے سلسلے میں بازپرس کرے گا۔(۲) اہلِ بدعت سے سنّت کے متعلق اور مسلمانوں سے اعمال کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔(۳) اس کا بھی اعتقاد کرے کہ اہلِ توحید سزا کے بعد دوزخ سے نکلیں گے۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے کوئی موحّد دوزخ میں باقی نہیں رہے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی موحّد ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا۔(۴) شفاعت پر ایمان لائے، پہلے شفاعت انبیاء علیہم السلام کریں گے پھر شہداء، بعد میں باقی تمام مسلمان۔ ہر شخص کو بارگاہِ ایزدی میں جس قدر عزّت و تکریم حاصل ہوگی اسی قدر اس کی سفارش منظور ہوگی۔ کچھ اہل ایمان ایسے باقی رہ جائیں گے جن کی کسی نے بھی سفارش نہ کی ہو۔ انہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے دوزخ سے نجات عطا کرے گا چنانچہ دوزخ میں کوئی صاحبِ ایمان ہمیشہ نہیں رہے گا بلکہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا وہ دوزخ سے نجات پائے گا۔

(۵) یہ اعتقاد رکھے کہ صحابہ کرام افضل ہیں اور افضلیت میں ان کے درجات کی ترتیب اس طرح ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب لوگوں میں افضل حضرت ابوبکرؓ ہیں۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ ان کے بعد حضرت عثمانؓ ان کے بعد حضرت علیؓ(۶) صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے سلسلے میں حسن ظن رکھے۔ ان کی تعریف کرے جس طرح اللہ اور اس کے رسول نے ان کی تعریف کی ہے۔

(۷) یہ سب وہ امور ہیں جنہیں احادیث نبوی اور آثار صحابہ و تابعین کی تائید حاصل ہے۔ جو شخص ان امور کا پورے یقین کے ساتھ اعتقاد رکھے گا وہ اہل سنّت والجماعت میں سے ہوگا۔ گمراہی اور بدعت سے دور رہے گا۔ ہم اپنے لیے اور عامة المسلمین کے لیے اللہ تعالیٰ سے کمال یقین اور راہ حق میں ثبات قدمی کی دعا کرتے ہیں۔ وہ ارحم الراحمین ہے و صلی اللہ علیٰ سیدنا محمد و آلہ واصحابہ اجمعین۔

(٭) عن ثوبان : يغت فيه ميزابان يمدانه من الجنة احدهما من ذهب والآخر من ورق (مسلم)
(۱) حساب پر ایمان لانے والے حساب میں سخت گیری اور چشم پوشی کرنے اور بعض لوگوں کے بلاحساب جنّت میں جانے کی حدیث حضرت عمرؓ سے بیہقی میں منقول ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں : "من نوقش الحساب عذب' قالت : قلت اليس يقول الله تعالى فسوف يحاسب حساباً يسيرا؟ قال ذلك العرض" بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس کی یہ حدیث بھی ہے۔ "عرضت على الامم فقيل هذه امتک و معهم سبعون الفا يدخلون الجنة بغير حساب ولا عذاب" (۲) عن ابى سعيد الخدرى : يدعى نوح يوم القيامة فيقول لبيک و سعديک يا رب' فيقول هل بلغت؟ فيقول' نعم : فيقال لامته' فيقولون ما اتانا من نذير فيقول من يشهد لک؟ الخ (۳) عن عائشة : من تكلم بشئى من القدر سئل عنه يوم القيامة (ابن ماجہ) عن ابى هريرة' ما من داع يدعو الى شئى الا وقف يوم القيامة لازما الدعوة ما دعا اليه وان دعا رجل رجلا (ابن ماجہ) (۴) ابوہریرہ کی ایک طویل حدیث کا اقتباس : "حتى اذا فرغ الله من القضاء بين العباد واراد ان يخرج برحمته من اراد من اهل النار امر الملائكة ان يخرجوا من النار من كان لا يشرک بالله شيئاً ممن اراد الله ان يرحمه ممن يقول لا اله الا الله (بخاری و مسلم) (۵) "عن عثمان بن عفان : يشفع يوم القيامة ثلاثة الانبياء ثم العلماء ثم الشهداء (ابن ماجہ) عن ابى سعيد الخدرى : من وجدتم فى قلبه مثقال حبة من خردل من الايمان فاخرجوه (بخاری و مسلم) ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں : شفعت الملائكة و شفعت النبيون و شفع المومنون ولم يبق الا ارحم الراحمين فيقبض قبضة من النار فيخرج منها قوماً لم يعملوا خيراً قط (بخاری و مسلم) (۶) عن ابن عمر : قال : كنا نخير بين الناس فى زمن النبى صلى الله عليه وسلم فنخير ابابكر ثم عمر بن الخطاب ثم عثمان بن عفان (بخاری) (۷) عن عبدالله بن مغفل : الله الله فى اصحابى لا تتخذوهم غرضا بعدى (ترمذی) وعن ابى سعيد الخدرى لا تسبوا اصحابى (بخاری و مسلم) وعن ابن مسعود : اذا ذكر اصحابى فامسكوا (طبرانی)

ابتدائی عقائد سے ترقی کر کے ایسے عقائد کا علم حاصل کرنا پڑتا ہے جس میں مختصر اور واضح دلائل موجود ہوں چنانچہ ہم آنے والے باب میں یہ دلائل بیان کر رہے ہیں اس سلسلے میں ہم اس مختصر مضمون پر اکتفا کرتے ہیں جو ہم نے قدس کے لوگوں کیلئے لکھا تھا۔ اس کا نام "رسالہ قدسیہ" ہے ذیل میں ہم اس مضمون کو لفظ بلفظ نقل کرتے ہیں۔

تیسرا باب

عقیدہ کے واضح دلائل

تمہید : تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں جس نے جماعت اہل سنت کو ایمان و یقین کے انوار سے ممتاز کیا۔ اور اہل حق کو ہدایت کا راہ نما بنایا۔ کجوں کی کجی' اور ملحدوں کی گمراہی سے انھیں بچا کر سید المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا عطا کی' آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اتباع کی توفیق بخشی' اور سلف صالحین کے اعمال و اقوال کی تقلید ان پر آسان فرمائی' یہاں تک کہ انھوں نے باقتضائے عقل اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیا' اور پچھلے لوگوں کی سیرت و عقائد کا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ یہ لوگ عقل کے نتائج' اور شرع منقول کے تقاضوں کے جامع قرار پائے' انھوں نے یہ حقیقت سمجھ لی کہ کلمہ طیبہ پڑھنا ہمارے لیے عبادت قرار دیا گیا ہے۔ لیکن لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی زبانی شہادت نتیجہ خیز اور کار آمد نہیں ہے جب تک وہ اصول نہ جان لیے جائیں جن پر اس کلمے کا مدار ہے' یہ دونوں جملے اپنے اختصار کے باوجود چار امور پر مشتمل ہیں۔ اول: خدا تعالیٰ کی ذات کا اثبات۔ دوم: اس کی صفات کا اثبات۔ سوم: اس کے افعال کا اثبات۔ چہارم: اس کے رسولوں کی تصدیق۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین کی بنیاد چار ارکان پر ہے' اور ہر ایک رکن کچھ اصول پر مشتمل ہے۔

پہلا رکن : اللہ کی ذات اور وحدانیت کی معرفت اس رکن کا مدار دس اصولوں پر ہے' یعنی یہ کہ وہ موجود ہے' ازلی ہے' ابدی ہے' جوہر نہیں' جسم نہیں' عرض نہیں' کسی جہت سے مخصوص نہیں' کسی مکان پر ٹھہرا ہوا نہیں' آخرت میں اس کا دیدار ہوگا۔ اکیلا ہے۔

پہلی اصل : خدا تعالیٰ کے وجود کی معرفت کے سلسلے میں بہترین طریقہ وہ ہے جس کی طرف قرآن پاک نے رہنمائی کی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے بیان کے بعد پھر کسی بیان کی اہمیت نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا۔ (پ ۳۰' ر ۱' آیت ۶ تا ۱۶)

کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو (زمین) کی میخیں نہیں بنایا اور ہم نے تم کو جوڑا جوڑا (مرد عورت) بنایا' اور ہم نے تمہارے سونے کو راحت بنایا۔ اور ہم ہی نے رات کو پردے کی چیز بنایا' اور ہم ہی نے دن کو معاش کا وقت بنایا۔ اور ہم ہی نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے' اور ہم ہی نے (آسمان میں) ایک روشن چراغ بنایا' اور ہم ہی نے پانی بھرے بادلوں سے کثرت سے پانی برسایا تاکہ ہم اس پانی کے ذریعہ سے غلہ اور سبزی اور گنجان باغ پیدا کریں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (پ ۲، ر ۳، آیت ۱۶۴)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کو بنانے میں' اور یکے بعد دیگرے رات دن کے آنے جانے میں اور جہازوں میں جو کہ سمندروں میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں لے کر' اور پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا' پھر اس سے زمین کو تر و تازہ کیا' اس کے خشک ہونے کے بعد۔ اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دیئے' اور ہواؤں کے بدلنے میں' اور ابر میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید رہتا ہے' دلائل (توحید کے) ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سلیم رکھتے ہیں۔

ایک جگہ فرمایا ہے:۔

اَلَمْ تَرَوْا كَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ثُمَّ یُعِیْدُكُمْ فِیْهَا وَیُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا (پ ۲۹، ر ۹، آیت ۱۵-۱۸)

کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان اوپر تلے پیدا کیے۔ اور ان میں چاند کو نور کی چیز بنایا' اور سورج کو (مثل) چراغ (روشن) بنایا۔ اور اللہ نے تم کو زمین سے ایک خاص طور پر پیدا کیا' پھر تم کو (بعد مرگ) زمین ہی میں لے جاوے گا۔ اور قیامت میں پھر اسی زمین سے تم کو باہر لے آوے گا۔

ایک جگہ ارشاد ہے:۔

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ (پ ۲۷، ر ۱۵، آیت ۵۸-۵۹)

اچھا پھر یہ بتلاؤ تم جو (عورتوں کے رحم میں) منی پہنچاتے ہو اس کو تم آدمی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں۔

ایک اور موقعہ پر یہ ارشاد فرمایا گیا:۔

نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ (پ ۲۷، ر ۱۵، آیت ۷۳)

ہم نے اس (آگ) کو یاددہانی کی چیز اور مسافروں کے فائدے کی چیز بنایا ہے۔

معمولی شعور رکھنے والا شخص بھی اگر ان آیات میں غور و فکر کرے' آسمان و زمین کے عجائبات پر نظر ڈالے' حیوانات اور نباتات کی تخلیق کا بنظر عبرت مشاہدہ کرے وہ یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ ان عجیب و غریب' اور مرتب محکم چیزوں کا کوئی بنانے والا بھی ہے جو ان کا نظام قائم رکھتا ہے' اور ان کی تقدیریں بناتا ہے' بلکہ نفوس کی فطرت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ وہ اس کے مسخر ہیں' اور اس کی تدبیر کے مطابق تغیر پذیر رہتے ہیں۔ کیا اسکے باوجود صانع کے وجود میں شک کیا جاتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (پ ۱۳، ر ۱۴، آیت ۱۰)

کیا تم کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک ہے جو کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

انبیاء کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کو توحید کی دعوت دیں' اور ان سے یہ اعتراف کرائیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے' انھوں نے لوگوں کو اس کا حکم نہیں دیا کہ وہ یہ کہیں کہ ہمارا ایک معبود ہے اور عالم کا ایک معبود ہے۔ کیوں کہ یہ حقیقت تو ان کی فطرت میں' روز اول سے موجود تھی۔ جیسا کہ قرآن پاک میں فرمایا گیا:۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (پ۲۱، ر۱۲، آیت ۲۵)
اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو ضرور یہی جواب دیں گے کہ اللہ نے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (پ۲۱، ر۷، آیت ۳۰)
سو تم یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف رکھو، اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے بدلنا نہ چاہیئے، پس سیدھا دین یہی ہے۔

غرض یہ کہ انسانی فطرت، اور قرآن پاک میں خدا کی وجود پر اس قدر شواہد اور دلائل موجود ہیں کہ عقلی دلائل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ لیکن ہم بطور تاکید مناظر علماء کی تقلید کرتے ہوئے اس کی بھی عقلی دلیل بیان کرتے ہیں۔

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ حادث چیز اپنے پیدا ہونے میں کسی سبب کی محتاج ہوتی ہے جو اس کو حادث کرے، عالم بھی حادث ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ بھی اپنے حدوث میں کسی سبب کا محتاج ہو، ہمارا یہ قول کہ حادث اپنے حدوث میں کسی سبب کا محتاج ہے ایک کھلی حقیقت ہے۔ اس لیے کہ ہر حادث کسی وقت کے ساتھ خاص ہے، عقل میں اس وقت سے اس کا پہلے یا بعد میں ہونا بھی ممکن ہے۔ چنانچہ حادث کا وقت مخصوص کے ساتھ خاص ہونا اور اس سے پہلے یا بعد کے وقت کے ساتھ مخصوص ہونا ظاہر ہے کہ کسی سبب سے ہی ہوگا۔ ہمارا یہ کہنا کہ عالم حادث ہے اس بناء پر ہے کہ اجسام حرکت و سکون سے خالی نہیں ہوتے۔ اور حرکت و سکون دونوں حادث ہیں۔ چنانچہ جو چیز کہ حادث سے خالی نہ ہو وہ بھی حادث ہے اس لیے عالم بھی حادث ہے۔

یہ دلیل تین دعوں پر مشتمل ہے۔ اوّل: یہ کہ اجسام حرکت و سکون سے خالی نہیں۔ یہ بات بدیہی ہے۔ کسی تأمل کی محتاج نہیں۔ کوئی شخص اگر کسی جسم کے بارے میں یہ تصور کرے کہ وہ نہ متحرک ہے اور نہ ساکن تو وہ جاہل ہے اور فہم و فراست سے بہت دور ہے۔ دوم: یہ کہ حرت و سکون دونوں حادث ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں، ایک کا وجود دوسرے کے بعد ہوتا ہے، اور یہ بات تمام اجسام میں مشاہد ہے۔ جو چیز ساکن ہے اس پر عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ یہ حرکت کر سکتی ہے، اور جو متحرک ہے اس کا ساکن ہونا بھی عقلاً ممکن ہے۔ ان دونوں میں سے جو حالت اس وقت جسم پر طاری ہوگی تو وہ طاری ہونے کی وجہ سے حادث ہوگی، اور اس سے پہلے کی حالت عدم کی وجہ سے حادث قرار پائے گی۔ اس لیے کہ اگر وہ حادث نہ ہو قدیم ہو تو اس کا عدم محال ہے جیسا کہ اس کا بیان اللہ تعالیٰ کی بقا کے بیان میں آئے گا۔ سوم: یہ کہ جو چیز حوادث سے خالی نہ ہوگی وہ حادث ہوگی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہر حادث سے قبل بہت سے حوادث ہونگے۔ اور ہر ایک حادث کی ابتدا نامعلوم ہوگی۔ اگر یہ سب حوادث منقطع نہ ہوں گے تو جو حادث اب موجود ہے اس کے وجود کے نوبت نہ آئے گی۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر آسمان کے دور کے ایسے ہوں کہ ان کی انتہا معلوم نہ ہو تو یہ ضروری ہے کہ ان کی تعداد طاق ہوگی یا جفت، یا طاق اور جفت دونوں، یا نہ جفت اور نہ طاق۔ آخر کی دونوں صورتیں محال ہیں۔ اس لیے کہ اس طرح نفی و اثبات کا اجتماع لازم آتا ہے، کیوں کہ جفت کے ثابت کرنے میں طاق کی نفی ہوتی ہے، اور اس کی نفی کرنے میں طاق کا اثبات ہے، یہ تعداد جفت بھی نہیں ہو سکتی، کیونکہ جفت ایک کے زیادہ ہونے سے طاق ہو جاتی ہے، تو جس شئی کی کوئی انتہا نہ ہو وہ ایک کی زیادتی سے کیسے بدل سکتی ہے؟ اور طاق بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ طاق ایک زیادتی سے جفت ہو جاتا ہے تو جس کے اعداد کی انتہا نہیں وہ ایک زیادتی سے کیسے بدل سکتا ہے؟ یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ تعداد نہ طاق اور نہ جفت، کیوں کہ اس کیلئے انتہا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ عالم جو حوادث سے خالی نہیں وہ خود بھی حادث ہے، اور جب اس کا حادث ہونا ثابت ہوا تو اس کا اپنے حادث کرنے والے کی طرف محتاج ہونا، بداہۃً

معلوم ہوتا ہے۔

دوسری اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ قدیم ازلی ہے' جس کے وجود کی ابتداء نہیں ہے' بلکہ وہ ہر چیز سے اور ہر زندہ و مردہ سے پہلے ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ قدیم نہ ہو' حادث ہو تو وہ بھی کسی حادث کرنے والے کا محتاج ہوگا اور وہ دوسرا تیسرے کا۔ یہاں تک یہ سلسلہ لامتناہی قرار پائے گا۔ اور جو شئی مسلسل ہوتی ہے وہ حاصل نہیں ہوتی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ سلسلہ دراز ہو کر کسی ایسے وجود پر ختم ہو جو قدیم ہو ازلی ہو' یہی ہمارا مقصود ہے' اور اسی کا نام ہم نے عالم کا بنانے والا' حادث کرنے والا' خالق اور موجود رکھا ہے۔

تیسری اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ ازلی بھی ہے اور ابدی بھی۔ اس کے وجود کا انجام نہیں ہے۔ بلکہ وہی اول ہے' وہی آخر ہے' وہی ظاہر ہے' وہی باطن ہے' اس لیے کہ جس کا قدیم ہونا ثابت ہو گیا اس کا معدوم ہونا محال ہے کیونکہ اگر وہ معدوم ہو تو دو حال سے خالی نہیں یا خود بخود معدوم ہو یا کسی مقابل کے معدوم کرنے کی وجہ سے معدوم ہو۔ پہلی صورت باطل ہے کیونکہ اگر یہ ممکن ہو کہ وہ شئی جس کا دوام مقصود ہے خود بخود معدوم ہو جایا کرے تو یہ بھی ممکن ہوگا کہ کوئی چیز خود بخود موجود بھی ہو جائے۔ اس لیے کہ جس طرح وجود کا حادث ہونا کسی سبب کا محتاج ہے' اسی طرح عدم کا طاری ہونا بھی سبب کا محتاج ہے' دوسری صورت بھی باطل ہے' اس لیے کہ اگر مقابل قدیم ہے تو اس کے ہوتے ہوئے وجود کیسے ہوا؟ جب کہ ہم اللہ تعالیٰ کا وجود اور قدم ثابت کر آئے ہیں' اور اگر مقابل حادث ہے تو یہ بھی ممکن نہیں' اس لئے اس حادث کا وجود اسی قدیم کی وجہ سے ہے' اور یہ ممکن نہیں کہ حادث قدیم کے مقابل آکر اس کا وجود ختم کر دے اور قدیم حادث کا وجود دفع بھی نہ کر سکے' حالانکہ دفع کرنے کی بہ نسبت آسان تر ہے' اور قدیم حادث کی نسبت قوی تر اور اولیٰ ہے۔

چوتھی اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ جوہر نہیں ہے کہ کسی جگہ میں گھرا ہوا ہو' بلکہ وہ مکان و حیز کی مناسبت سے پاک و برتر ہے' اس کی دلیل یہ ہے کہ جو ہر کسی جگہ میں گھرا ہوا ہے اور وہ اس جگہ کے ساتھ خاص ہے' پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جوہر اپنے حیز یا مکان میں ساکن (ٹھہرا ہوا) ہوگا یا متحرک (حرکت والا)۔ وہ حرکت و سکون سے خالی نہیں ہوگا اور یہ دونوں چیزیں حادث ہیں۔ اور جو چیز حوادث سے خالی نہ ہو وہ بھی حادث ہوتی ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کو مکان میں گھرا ہوا کوئی جوہر قدیم تصور کیا جائے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ عالم کے جوہروں کو بھی قدیم تصور کیا جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص باری تعالیٰ کو ایسا جوہر بتلائے جو کسی مکان میں گھرا ہوا نہ ہو تو وہ شخص لفظ کے اطلاق کے اعتبار سے خطاوار کہلائے گا۔ معنی کے اعتبار سے خطاوار نہیں ہوگا۔

پانچویں اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا جسم نہیں ہے جو جواہر سے مرکب ہو۔ اس لیے کہ جسم اسی کو کہتے ہیں جو جواہر سے مرکب ہو' چوتھی اصل میں ہم یہ ثابت کر آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جوہر نہیں' اور نہ وہ کسی مخصوص مکان میں گھرا ہوا ہے۔ ہمارے اس دعوٰی سے اس کا جسم ہونا باطل قرار پایا۔ کیوں کہ ہر جسم ایک حیز کے ساتھ مخصوص ہے اور جواہر سے مرکب ہے' چنانچہ جسم کا متفرق ہونے' جمع ہونے' حرکت' سکون' صورت اور مقدار سے خالی ہونا محال ہے۔ اور یہ سب حادث ہونے کے علامتیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو جسم ماننے میں ایک اور خرابی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس طرح لوگ چاند' سورج اور دوسرے اجسام کے بارے میں بھی صانع عالم ہونے کا اعتقاد کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ پھر اگر کوئی گستاخ اللہ تعالیٰ کو جسم قرار دے' لیکن ساتھ ہی یہ دعوٰی بھی کرے کہ وہ جسم جوہر سے مرکب نہیں ہے تو اس کی یہ اصطلاح لفظ کے اعتبار سے غلط ہوگی۔ تاہم جسمیت کی نفی اس میں بھی پائی جائے گی۔

چھٹی اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ عرض نہیں کہ کسی جسم کے ساتھ قائم ہو یا کسی محل میں حلول کئے ہوئے ہو۔ اس لیے کہ ہر

جسم حادث ہے اور یہ ضروری ہے کہ حادث کرنے والا حادث سے پہلے موجود ہو' چنانچہ اللہ کسی جسم میں کیسے حلول کر سکتا ہے۔ وہ تو ازل میں تنہا تھا اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ تھا۔ پھر اس نے اعراض و اجسام پیدا کئے' دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علم' قدرت' ارادہ اور تخلیق وغیرہ کے ساتھ موصوف ہے' جیسا کہ ہم عنقریب اس کی تفصیل بیان کریں گے۔ یہاں صرف اتنا بیان کرنا ہے کہ یہ اوصاف اعراض پر محال ہیں بلکہ یہ اوصاف اسی موجود کیلئے سمجھ میں آتے ہیں جو خود بخود قائم ہو' اور اپنی ذات سے مستقل ہو۔

ان چھ اصلوں سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اللہ موجود ہے۔ اپنے آپ قائم ہیں' نہ جوہر ہے' نہ عرض ہے اور یہ کہ عالم جواہر' اعراض اور اجسام کا نام ہے' اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کے مشابہ نہیں' اور نہ کوئی اس کے مشابہ ہے' بلکہ وہ زندہ اور قیوم ہے' اس کی کوئی نظیر نہیں' اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خالق مخلوق کے مشابہ ہو' یا قادر مقدور کے اور مصوّر تصویر سے مشابہت رکھتا ہو' اجسام و اعراض سب اسی کی تخلیق اور صنعت کا نمونہ ہیں' ان کا خدا تعالیٰ کا مشابہ اور مثل ہونا محال ہے۔

ساتویں اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سمتوں اور جہتوں کی تخصیص سے پاک و صاف ہے۔ جہتیں یہ ہیں۔ اوپر' نیچے' دائیں' بائیں' آگے اور پیچھے۔ یہ سب جہتیں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے ساتھ تخلیق فرمائیں اس لیے کہ اللہ نے انسان کی دو جہتیں ایسی بنائیں کہ ان میں سے ایک کا تعلق زمین کی سطح سے ہو اور دوسری اس کے بالمقابل ہو۔ اول الذکر کا نام پاؤں ہے' اور ثانی الذکر کا نام سر ہے' اوپر اس جہت کیلئے بنا جو سر کی طرف ہے' اور نیچے اس جہت کیلئے بنا جو پاؤں کی جانب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چیونٹی کسی چھت میں الٹی چلے تو وہ چھت اس کے اعتبار سے نیچی قرار پائے گی' اور ہمارے اعتبار سے اوپر۔۔۔ نیز انسان کیلئے دو ہاتھ بنائے۔ ان میں سے ایک دوسرے کی بہ نسبت قوی تر ہوتا ہے۔ جو قوی تر ہاتھ ہے اس کا نام دایاں رکھا گیا۔ اور اس کے مقابل کا نام بایاں قرار دیا گیا۔ چنانچہ جو جہت اول الذکر کی جانب ہوئی اس کا نام دائیں جہت ہوا۔ اور جو جہت ثانی الذکر کی جانب آئی اس کا نام بائیں جہت ہوا۔۔۔ انسان کیلئے دو جہتیں مزید بنائیں' ایک کی طرف سے وہ دیکھتا ہے' اور اسی جانب چلتا ہے' جس طرف وہ چلتا ہے اس کا نام آگے ہوا۔ اور اس جہت کی مقابل جہت کا نام پیچھے ہوا۔ فرض کیجئے اگر انسان ان جہتوں پر پیدا نہ ہوا ہوتا تو گیند کی طرح گول ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ازل میں کسی جہت سے خاص کیسے ہو سکتا ہے جب کہ یہ سب جہتیں حادث ہیں اور نہ اب کسی طرح کسی جہت سے خاص ہو سکتا ہے کیونکہ انسان کی پیدائش کے وقت وہ کسی جہت کے ساتھ مخصوص نہیں تھا اب کیسے ہو سکتا ہے۔

وہ اس بات سے منزّہ اور پاک ہے کہ اس کیلئے اوپر ہو' کیونکہ وہ اس سے بھی منزّہ اور پاک ہے' کہ اس کا سر ہو' اوپر اسی جہت کو کہتے ہیں کہ جو سر کی جانب ہو۔۔۔ اسی طرح وہ نیچے سے بھی برتر و بالا ہے' کیونکہ نیچے اس سمت کا نام ہے جو پاؤں کی جانب ہو' اور اللہ تعالیٰ پاؤں سے پاک ہے۔۔۔ ان جہتوں کے ساتھ اس کے مخصوص نہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی جہت کے ساتھ مخصوص ہو تو عقل یہ کہتی ہے کہ وہ جواہر کی طرح اپنے حیز سے مخصوص ہوگا' یا اعراض کی طرح کسی جوہر کی ساتھ خاص ہوگا۔ اور کیونکہ اس کا جوہر اور عرض ہونا دونوں محال ہیں' اس لیے اس کا کسی جہت کے ساتھ مخصوص ہونا بھی محال ہے۔ ہاں! اگر جہت کے معروف و متعارف معنیٰ مراد لی جائیں تو یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں معنیٰ صحیح ہوگا لیکن باعتبار لفظ کے غلط ہوگا' ان جہتوں کے ساتھ باری تعالیٰ کے مخصوص نہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اگر وہ عالم کے اوپر ہو تو اس کے محاذی بھی ہوگا۔ اور کسی جسم کا محاذی اس کے برابر ہوتا ہے' یا اس سے چھوٹا' یا اس سے بڑا۔ ان تینوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کیلئے مقدار کی ضرورت تسلیم کرنی ہوگی۔ حالانکہ اس کی ذات اس سے بری ہے۔

یہاں یہ سوال ضرور کیا جا سکتا ہے کہ دعا کے وقت ہاتھ آسمان کی طرف کیوں اٹھائے جاتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دعا کا قبلہ وہی سمت ہے۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جس سے دعا کی جا رہی ہے' اس میں جلال اور کبریائی کی صفت بھی موجود ہے اور بلندی کی سمت جلالتِ شان اور عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ قہر' بزرگی' اور غلبے کے اعتبار سے ہر ایک موجود کے اوپر ہے

آٹھویں اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے' استواء کے ان معنوں میں جو اس نے مراد لیے ہیں۔ یعنی وہ معنیٰ جو اس کی کبریائی کے مخالف نہیں' اور نہ اس میں۔ حدوث اور فنا کی علامتوں کو دخل ہے آسمان پر مستوی ہونے کے یہی معنیٰ ذیل کی آیت میں مراد لیے ہیں۔

ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (پ ۲۴' ر ۱۶' آیت ۱۱)

پھر چڑھا آسمان کی طرف اور دھواں ہو رہا تھا۔

یہ معنیٰ قہر اور غلبے ہی کے اعتبار سے ہوتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے

قد استوٰی بشر علی العراق — من غیر سیف ودم مھراق

(ترجمہ۔ بشر تلوار اور خون بہائے بغیر عراق پر غالب آگیا ہے۔)

اہل حق کو مجبوراً یہ تاویل کرنی پڑی ہے۔ جس طرح اہل باطل کو اس آیت کی تاویل کرنی پڑی ہے۔

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ (پ ۲۷' ر ۱۷' آیت ۴)

وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں تم رہو۔

اس کے معنیٰ بالاتفاق یہی بیان کئے گئے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہونے کا مطلب احاطہ اور علم ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کو۔

قلب المؤمن بین اصبعین من اصابع الرحمٰن (مسلم)

مومن کا دل اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے۔

قدرت' قہر اور غلبے پر محمول کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس حدیث کو۔

الحجر الاسود یمین اللہ فی ارضہ (مسلم)

حجر اسود زمین میں اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے۔

عظمت اور تقدس پر محمول کیا گیا ہے۔ ان الفاظ کو اگر اپنے ظاہر پر رہنے دیا جائے تو اس سے محال لازم آتا ہے اسی طرح اگر استواء کو ٹھہرنے اور جگہ پکڑنے کے معنیٰ میں قرار دیا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جگہ پکڑنے والا جسم ہو' عرش سے لگا ہوا ہو۔ اس کے برابر ہو۔ اس سے بڑا ہو یا اس سے چھوٹا ہو' اللہ تعالیٰ کیلئے جسم اور مقدار کا محال ہونا پہلے ثابت کیا جا چکا ہے۔

نویں اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ صورت' مقدار' اور جہات سے منزّہ اور پاک ہونے کے باوجود آخرت میں آنکھوں سے دکھائی دے گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (پ ۲۹' ر ۱۷' آیت ۲۲-۲۳)

بہت سے چہرے اس وقت بارونق ہوں گے اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت محال ہے' جیسا کہ قرآن پاک میں فرمایا گیا:۔

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (پ ۷' ر ۱۹' آیت ۱۰۳)

اس کو نہیں پا سکتیں آنکھیں اور وہ پا سکتا ہے آنکھوں کو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب دیدار کی خواہش کا اظہار کیا تو فرمایا:۔

لَنْ تَرَانِي (پ ۹' ر ۷' آیت ۱۴۳)

تو ہرگز مجھ کو نہ دیکھ سکے گا۔

ہمیں کوئی یہ بتلائے کہ اللہ تعالیٰ کی جو صفت (رؤیت دنیا میں) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہ ہو سکی اسے یہ معتزلی کیسے

جان گیا۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس بات سے انبیاء علیہم السلام واقف نہ ہوں اس سے یہ کند ذہن اہل بدعت بھی ناواقف ہوں۔ آیت رؤیت کو آخرت پر محمول کیا گیا ہے' آخرت میں رؤیت ممکن ہے محال نہیں ہے اس لیے کہ دیکھنا ایک قسم کا علم اور کشف ہے' فرق صرف یہ ہے کہ علم کی بہ نسبت رؤیت زیادہ واضح اور زیادہ مکمل ہے۔ جس طرح یہ درست ہے کہ علم خدا تعالیٰ سے متعلق ہو اور وہ کسی جہت میں نہ ہو' اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ رؤیت اس کی متعلق ہو اور وہ کسی جہت میں نہ ہو' اور جیسے یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ خلق کو دیکھتا ہے اور ان کے مقابل نہیں اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ مخلوق اسے دیکھے اور مقابلہ نہ ہو۔ اور جس طرح باری تعالیٰ کو بغیر کیفیت اور بغیر صورت کے جاننا ممکن ہے اسی طرح اس کی رؤیت بھی کیفیت اور صورت کے بغیر ممکن ہے۔

دسویں اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے' اسکا کوئی شریک نہیں' یکتا ہے' اس کا کوئی مثل نہیں' وہ تخلیق اور ابداع میں منفرد ہے' وہ ایجاد و اختراع میں اکیلا ہے' نہ اس کا کوئی مثل ہے کہ مشابہ اور مساوی ہو' اور نہ اس کا کوئی مقابل ہے کہ اس سے نزاع کرے' یا اس کے منافی ہو' اس پر یہ آیت کریمہ دلیل ہے۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (پ ۱۷' ر ۲' آیت ۲۲)

اگر ہوتے آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کچھ اور معبود تو دونوں برباد ہو جاتے۔

اس کی تقریر یہ ہے کہ اگر دو خدا ہوں اور ان میں سے ایک کوئی کام کرنا چاہے' تو دو صورتیں ہوں گی۔ یا تو دوسرا اس کی موافقت پر مجبور ہوگا۔ اس صورت میں اسے عاجز اور مقہور تصور کیا جائے گا' یا دوسرا پہلے کی مخالفت پر قادر ہوگا اس صورت میں پہلا ضعیف اور عاجز قرار پائے گا۔

دوسرا رکن : اللہ تعالیٰ کی صفات کا جاننا۔ یہ رکن بھی دس اصولوں پر مشتمل ہے۔

پہلی اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے اور اپنے اس ارشاد میں سچا ہے۔

وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (پ ۲۹' ر ۱' آیت ۱)

اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عالم اپنی صنعت میں محکم اور اپنی تخلیق میں مرتب و منظم ہے' اس سے اس کے خالق کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص ریشم کا بنا ہوا کوئی خوبصورت منقش کپڑا دیکھے اور یہ خیال کرے کہ اسے کسی مردہ انسان نے بنایا ہوگا یا کسی ایسے شخص نے بنا ہوگا جو اسے بنانے پر قادر نہ ہو تو ایسے شخص کو دائرہ عقل سے خارج سمجھا جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے عالم کو دیکھ کر اس کے صانع کی بے پناہ قدرت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ موجودات کا جاننے والا ہے' اس کا علم تمام مخلوقات کو محیط ہے۔ آسمان و زمین کا کوئی ذرہ ایسا نہیں ہے کہ جو اس کے علم میں نہ ہو۔ وہ اپنے اس قول میں سچا ہے۔

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (پ ۱' ر ۳' آیت ۲۹)

اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔

یہ آیت بھی اس کے علم پر دلالت کرتی ہے۔

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (پ ۲۹' ر ۱' آیت ۱۴)

بھلا وہ جانے جس نے پیدا کیا۔ اور وہی ہے بھیدوں کا جاننے والا' خبردار۔

اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ خلق (پیدا کرنے) سے علم پر استدلال کرلو' مخلوق کی لطافت و نزاکت اور صنعت میں ترتیب و

نظم سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس کا صانع ترتیب و نظام کی کیفیت کو بخوبی سمجھتا ہے چنانچہ جو کچھ اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ وہی اس باب میں انتہاء ہے۔

تیسری اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے۔ اس لیے کہ جس کا علم اور جس کی قدرت ثابت ہے اس کی حیات بھی ثابت ہوگی۔ حیات کے بغیر علم و قدرت کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اگر کسی قادر اور علیم و خبیر کا وجود مردہ تصور کرلیا جائے تو پھر حیوانات کی زندگی اور ان کی حرکات و سکنات کے بارے میں یہی رائے قائم کرنی ہوگی' بلکہ اہل حرفت و صنعت' شہروں اور جنگلوں میں پھرنے والے' تاجر اور ملک در ملک گھومنے والے سیاح سب بے جان قرار دیئے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور ایک کھلی جہالت اور ایک واضح گمراہی ہے۔

چوتھی اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ اپنے افعال کا ارادہ کرنے والا ہے۔ جو کچھ موجود ہے وہ اس کی مرضی سے ہے' اسی کے ارادے سے صادر ہے' اسی نے اولاً پیدا کیا ہے' وہی مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا' وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے صاحب ارادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جو فعل اس سے صادر ہوتا ہے ممکن ہے کہ اس کی ضد کا صدور بھی ہوجائے۔ یا وہ فعل جو ضد نہیں رکھتا کسی قدر تاخیر یا تقدیم سے صادر ہو' جہاں تک محض قدرت کا تعلق ہے وہ فعل اور اس کی ضد' مقدم' مؤخر اور متعین اوقات سے یکساں مناسبت رکھتی ہے' اس لیے ضروری ہوا کہ ایک ارادہ بھی ہو' جو قدرت کو اس امر کی طرف منتقل کردے جس کا ارادہ کیا جارہا ہو۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ علم کی موجودگی میں ارادے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور کوئی شئی جو اپنے وقت میں اپنی حالت پر پائی گئی تو اس کی وجہ ارادہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ اس وقت میں اور اس حالت پر شئی کے وجود کا علم پہلے سے تھا ہم کہیں گے اس طرح تو قدرت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی چیز موجود ہوجائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے وجود میں قدرت کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ اس لیے وجود پذیر ہوئی کہ اس کے موجود ہونے کا علم پہلے سے تھا۔

پانچویں اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ سننے والے اور دیکھنے والا ہے' دلوں کے وسوسے اور افکار و خیالات بھی اسکے دیکھنے سے بچ نہیں سکتے' رات کی تاریکی میں سخت پتھر پر رینگنے والی چیونٹی کی آواز بھی اس کے سننے سے باہر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر کیسے نہ ہوگا؟ اس لیے کہ سننا اور دیکھنا وصف کمال ہے' کوئی نقص یا عیب کی بات نہیں ہے۔ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کی مخلوق اس کے مقابلے میں کامل ہو' مصنوع صانع سے برتر ہو۔ اس صورت میں اعتدال کیسے باقی رہے گا جب کہ خالق کے حصہ میں نقصان اور مخلوق کے حصے میں کمال رہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ استدلال کیسے درست قرار پائے گا جو انھوں نے اپنے باپ کے سامنے کیا تھا۔

لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا (پ ۱۶' ر ۶' آیت ۴۲)

کیوں پوجتا ہے تو اس چیز کو جو نہ سنے نہ دیکھے اور نہ تجھے کوئی فائدہ پہنچائے۔

اگر یہی بات معبود حقیقی کے سلسلے میں بھی لازم آئے تو کیا ان کا یہ استدلال باطل قرار نہ پائے گا۔ اور خدا تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی غلط نہ ٹھہرے گا۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ

(پ ۷' ۱۶ آیت ۸۳)

اور یہ ہماری حجت ہے جو ہم نے ابراہیمؑ کو ان کی قوم کے مقابلے میں عطا کی ہے۔

جس طرح اعضاء کے بغیر خدا کا فاعل ہونا' اور دل و دماغ کے بغیر خدا کا عالم ہونا سمجھا گیا ہے اسی طرح آنکھ اور کان کے بغیر خدا

تعالیٰ کو سمیع اور بصیر سمجھنا چاہیئے۔ بظاہر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

چھٹی اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ کلام کرتا ہے اور وہ کلام ایسا وصف ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے' نہ وہ آواز ہے اور نہ حرف' جس طرح اس کا وجود کسی دوسرے کے وجود سے مشابہت نہیں رکھتا' اسی طرح اس کا کلام بھی کسی دوسرے کے کلام سے مشابہ نہیں ہے۔ حقیقت میں کلام وہی ہے جو نفس کا کلام ہو' حروف اور آواز تو صرف اظہار کیلئے ہیں۔ کبھی کبھی محض حرکات و سکنات اور اشاروں سے بھی بات سمجھا دی جاتی ہے۔ حیرت ہے کہ بعض لوگ اس حقیقت کے ادراک سے محروم رہ گئے' حالانکہ جاہل اور کند ذہن شعراء بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

ان الکلام لفی الفؤاد وانما جعل اللسان علی الفؤاد دلیلا۔

(ترجمہ۔ کلام تو دل میں ہوتا ہے' زبان تو محض دل کی ترجمان ہے۔)

جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ میری زبان حادث ہے اور اس زبان پر میری حادث قدرت کی بناء پر جو کلام جاری ہوا ہے وہ قدیم ہے ایسے شخص سے عقل کی توقع نہ رکھو اور اس سے گفتگو مت کرو۔ بھلا یہ شخص خطاب کے قابل ہے جو نہ سمجھے کہ قدیم اسے کہتے ہیں جس سے پہلے کوئی دوسری چیز نہ ہو حالانکہ بسم اللہ میں جو سین ہے' اس سے پہلے "ب" ہے اس لیے سین کو قدیم نہیں کہا جا سکتا۔ تم ایسے شخص کی طرف ہرگز توجہ مت دو۔ یہ اسی لائق ہے۔ کہ اس سے گریز کیا جائے۔ کیونکہ بعض بندوں کو اللہ تعالیٰ نے ان حقائق و مطالب سے محروم رکھا ہے۔ اس میں بھی اس حکیم و دانا کی کوئی حکمت ہے۔ جسے وہ گمراہ کرلے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

جو شخص یہ بات خارج از امکان سمجھتا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ السلام نے دنیا میں ایسا کلام سنا ہے جس میں آواز اور حرف نہ ہوں اسے یہ بات بھی محال سمجھنی چاہیئے کہ قیامت میں ایک ایسے موجود کا دیدار ہوگا جس کے نہ جسم ہے' اور نہ رنگ۔ اگر وہ یہ بات سمجھتا ہے اور اس کا یقین رکھتا ہے کہ کسی بے جسم' بے رنگ' بے کیفیت اور بے مقدار موجود کا دیدار ہوگا تو کے سلسلے میں بھی یہی یقین رکھنا چاہیئے کہ ایک ایسا کلام ہے جو حروف اور آواز کی قیود سے آزاد ہے' اگر اس شخص نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے صفت علم ہے اور وہ سب موجودات سے واقف ہے' تو اسے اللہ تعالیٰ کیلئے صفت کلام کا بھی اعتقاد رکھنا چاہیئے کہ جتنی باتیں بھی عبارات اور الفاظ کے ذریعہ ہم سمجھتے ہیں وہ سب اس کا کلام ہیں اور اگر عقل یہ تسلیم کرتی ہے کہ زمین' جنت اور دوزخ اور ساتوں آسمان کاغذ کے پرزے پر لکھے جا سکتے ہیں۔ دل کی زرہ برابر جگہ میں محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اور تل کے برابر آنکھ کی پتلی سے نظر آسکتے ہیں مگر یہ سب کاغذ کے پرزے پر' دل کی سطح پر' اور آنکھ کے ڈھیلے میں بعینہٖ اتر نہیں جاتے۔ اسی طرح یہ بھی باور کرلینا چاہیئے کہ اللہ کا کلام زبانوں سے پڑھا جاتا ہے۔ دلوں میں محفوظ رہتا ہے' مصاحف میں لکھا جاتا ہے لیکن نفس کلام زبان' دل اور مصحف میں حلول نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اگر کلام اللہ کے لکھنے سے ورق میں کلام حلول کر جائے تو خدا کا نام لکھنے سے اس کی ذات بھی ورق میں آجائے اور آگ کا نام لکھنے سے آگ بھی کاغذ کی سطح پر روشن ہو جائے اور اسے جلا ڈالے۔

ساتویں اصل : یہ جاننا کہ جو کلام خدا تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے وہ قدیم ہے اسی طرح اس کی تمام صفات بھی قدیم ہیں کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات حوادث کا محل ہو' اس لیے کہ حوادث بدلتے رہتے ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی صفات کیلئے بھی قدیم ہونے کا وہی وصف واجب ہے جو اس کی ذات کیلئے واجب ہے تاکہ اس پر تغیرات طاری نہ ہوں اور اس میں حوادث حلول نہ کریں' بلکہ وہ ہمیشہ سے ازل میں ان صفات کے ساتھ متصف رہا ہے' اسی طرح ابد میں رہے گا۔ وہ حالات کے تغیر سے پاک ہے' جو چیز حوادث کا محل ہو وہ خود حادث ہوتی ہے۔ اجسام پر حدوث طاری ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ تغیر کو قبول کرتے ہیں' اور ان کی اوصاف میں رد و بدل جاری رہتا ہے بھلا خالق تغیرات قبول کرنے میں اجسام کا شریک کیسے ہو سکتا ہے؟ اسی سے یہ امر ثابت ہوتا

ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام قدیم ہے اور اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے حادث صرف وہ آوازیں ہیں جو مذکورہ کلام پر دلالت کرتی ہیں۔
جس طرح یہ سمجھ میں آتا ہے کہ لڑکے کے پیدا ہو جانے سے پہلے اسے تحصیل علم کیلئے حکم کرنا باپ کے ساتھ قائم ہوتا ہے' جب لڑکا بڑا ہو جاتا ہے' اور اسے عقل آجاتی ہے' تب اس امر کا علم جو باپ کے دل میں تھا لڑکے میں پیدا کر دیا جاتا ہے' اس طرح وہ اس امر کا مامور ہو جاتا ہے جو اس کے باپ کے ساتھ قائم ہے۔ اور جب تک لڑکا اس امر کا علم حاصل نہیں کر لے گا اس وقت تک اس امر کا وجود قائم رہے گا۔ اس طرح یہ سمجھنا چاہیئے کہ جس امر پر یہ ارشاد باری دلالت کر رہا ہے۔

فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ (پ ۱۶' ۸' آیت ۱۲)

اپنی جوتیاں اتارو۔

وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے' اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس کا خطاب ان کی پیدائش کے بعد اس وقت ہوا جب اللہ نے ان کے دل میں اس حکم کی معرفت پیدا فرمائی اور کلام قدیم سننے کیلئے انھیں قوت سماعت عطا فرمائی۔

آٹھویں اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے' یعنی وہ اپنی ذات صفات کا ازلی علم رکھتا ہے' اور جو کچھ مخلوقات میں حادث ہوتا ہے اسے ازل سے جانتا ہے' اسکا علم نیا پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ سب حوادث علم ازل سے اس کے سامنے منکشف رہتے ہیں۔ مثلاً ہمیں یہ علم ہو کہ زید طلوع آفتاب کے وقت آئے گا۔ اور جب تک آفتاب نہ نکلے اس وقت تک اس علم میں تبدیلی نہ ہو تو اس وقت متعین پر زید کے آنے کا علم ہمیں اسی پرانے علم سے ہوگا۔ اس کے لیے کوئی نیا علم پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے علم قدیم کو بھی اس مثال کی روشنی میں سمجھنا چاہیئے۔

نویں اصل : یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ قدیم ہے' اس کا ارادہ علم ازل کے مطابق حوادث کو ان کے مخصوص اور مناسب اوقات میں پیدا کرنے کے ساتھ متعلق ہے۔ اللہ کا ارادہ اس لیے قدیم ہے کہ اگر حادث ہو تو اس کی ذات حوادث کا محل ٹھہرے گی' اور اگر اس کا ارادہ اس کی ذات کے علاوہ کسی دوسرے میں حادث ہو تو وہ ارادہ کرنے والا نہیں کہا جائے گا جس طرح تمہیں اس وقت تک متحرک نہیں جا سکتا جب تک حرکت تمہاری ذات میں موجود نہ ہو۔ اگر اس کے ارادے کو حادث مانا جائے تو اس کے حدوث کیلئے کسی دوسرے کی ضرورت پیش آئے گی' اس دوسرے کیلئے تیسرے کی' یہ سلسلہ لامتناہی قرار پائے گا۔ اور یہ محال ہے' اسی طرح اس کا حادث ہونا بھی محال ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ ارادے کا حادث ہونا کسی دوسرے ارادے کے بغیر ممکن ہے تو یہ بھی ممکن ہوگا کہ عالم کسی ارادے کے بغیر حادث ہو۔

دسویں اصل : یہ جاننا کہ اللہ علم سے عالم ہے' حیات سے زندہ ہے' قدرت سے قادر ہے' ارادے سے مرید ہے' کلام سے متکلم ہے' سننے سے سمیع ہے' دیکھنے سے بصیر ہے' اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ بغیر علم کے عالم ہے تو گویا وہ یوں کہتا ہے کہ فلاں شخص بغیر مال کے مالدار ہے یا علم بغیر عالم کے ہے اور عالم بغیر معلوم کے ہے' حالانکہ علم' عالم اور معلوم ایک' دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح قتل' اور قاتل اور مقتول کے بغیر ممکن نہیں' یا مقتول قتل اور قاتل کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح عالم علم کے بغیر' علم معلوم کے بغیر اور معلوم علم کے بغیر نہیں پایا جاتا۔ بلکہ یہ تینوں عقلاً ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں' ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ جو شخص عالم کو علم سے جدا تصور کرتا ہے اسے چاہیئے کہ وہ عالم کو معلوم سے اور علم کو عالم سے بھی علیحدہ قرار دے۔ کیونکہ ان نسبتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سب ایک ہی ہیں۔

تیسرا رکن : اللہ تعالیٰ کے افعال کی معرفت۔ یہ رکن بھی دس اصولوں پر مشتمل ہے۔

پہلی اصل : یہ ہے کہ عالم میں جتنے بھی حوادث (مخلوقات) ہیں وہ سب اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اسی کا فعل اور اس کی

اختراع ہیں۔ اس کے سوا نہ کوئی خالق ہے اور نہ موجود' اسی نے اپنی مخلوق کی قدرت' اور حرکت پیدا فرمائی۔ بندوں کے تمام افعال اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں' اور اسی کی قدرت سے وابستہ ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (پ ۲۴' ر ۳' آیت ۶۲)

اللہ ہر چیز کا خالق ہے۔

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (پ ۲۳' ر ۷' آیت ۹۶)

اللہ نے تمہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو اسے بنایا۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا:۔

وَاَسِرُّوْا قَوْلَکُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (پ ۲۹' ر ۱' آیت ۱۴)

اور تم اپنی بات چھپا کر کہو یا کھول کر۔ اللہ دلوں کا حال جاننے والا ہے۔ کیا وہ اللہ نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا اور وہی رازوں کا جاننے والا خبردار ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اقوال' افعال' اسرار اور ارادوں میں احتیاط رکھیں' اس لیے کہ وہ ان سے واقف ہے' اس نے اپنے کمالِ علم کے اثبات پر دلیل دی ہے کہ وہ ان کے افعال و اعمال اور اقوال و اسرار کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ بندوں کے افعال کا خالق کیسے نہ ہو گا؟ اس کی قدرت کامل ہے اس میں کسی طرح کی کمی نہیں ہے۔ اس کی قدرت بندوں کی حرکات سے متعلق ہے' اور سب حرکات یکساں ہیں۔ اور قدرت کا ان سے تعلق بھی یکساں ہے' پھر کیا وجہ ہے کہ بعض حرکات سے اس کا تعلق ہو اور بعض سے نہ ہو۔ یا یہ کیسے ممکن ہے کہ حیوان اپنے افعال کا خود خالق ہو' حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مکڑی اور شہد کی مکھی سے بھی وہ افعال صادر ہوتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ حالانکہ انھیں مخترع اور موجد نہیں کہہ سکتے۔ انھیں تو اپنے کاموں کی تفصیل بھی معلوم نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مخلوقات سب اسی کی قدرت اختراع و ایجاد کی دلیل ہیں۔ ملکوت میں مخترع وہی ہے جو کہ زمین اور آسمان کا جبار ہے۔

دوسری اصل : یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حرکات و افعال بندے کے تحت قدرت اکتساب کے طور پر بھی نہ رہیں بلکہ اللہ نے قدرت اور مقدور دونوں کو پیدا فرمایا ہے۔ اختیار اور ذی اختیار دونوں کو بنایا ہے' قدرت بندے کا ایک وصف ہے۔ اور یہ وصف اللہ نے پیدا کیا ہے اس کا کسب نہیں ہے۔ حرکت بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے۔ لیکن یہ بندے کی صفت اور اس کا کسب ہے' یعنی یہ صفت بندے کی ایک اور وصف کے زیر اثر ہوئی ہے جسے قدرت کہتے ہیں۔ اسی اعتبار سے حرکت کو کسب کہا جاتا ہے۔ بندے کی یہ حرکت جبر محض نہیں ہو سکتی اس لیے کہ وہ اپنی اختیاری اور اضطراری (غیر اختیاری) حرکات کا فرق جانتا ہے' تاہم وہ اپنی ان حرکات کا خالق بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی لیے کہ وہ بے چارہ تو ان سب حرکات کی تفصیل بھی نہیں جانتا جو اس سے اختیاری طور پر صادر ہوتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ اب ایک درمیانی صورت رہ جاتی ہے اور یہ اعتقاد کرنا ہے کہ تمام حرکات اختراع و ایجاد کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و تصرف میں ہیں۔ اور اکتساب کے اعتبار سے بندے کے اختیار میں ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جس چیز سے قدرت کا تعلق ہو وہ فقط اختراع کے اعتبار سے مثلاً دیکھئے! ازل میں اللہ تعالیٰ کی قدرت عالم سے متعلق تھی۔ حالانکہ اختراع کا وجود بھی نہ تھا۔ پھر اختراع کے وقت بھی قدرت عالم سے متعلق ہے لیکن اس وقت قدرت کی نوعیت مختلف ہے۔ غرض یہ کہ قدرت کے متعلق ہونے کا یہی مطلب نہیں کہ مقدور چیز اس سے حاصل بھی ہو جائے۔

تیسری اصل : یہ ہے کہ بندے کا فعل اگرچہ اس کا کسب ہے' اس کے دائرہ اختیار میں ہے' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ

فعل خدا تعالےٰ کے ارادے اور مشیت سے باہر ہے۔ بلکہ ملک اور ملکوت میں جو کچھ ہوتا ہے خواہ پلک جھپکتا ہو' یا دل کا کسی طرف متوجہ ہونا' خیر ہو یا شر' نفع ہو یا ضرر' اسلام ہو یا کفر' معرفت ہو یا جہل' کامیابی ہو یا ناکامی' گمراہی ہو یا ہدایت' اطاعت ہو یا معصیت' شرک ہو یا ایمان' سب اسی کے قضاء و قدر سے ہیں' اسی کے ارادے اور خواہش سے ظہور میں آتے ہیں' نہ کوئی اسکے فیصلے کو منسوخ کر سکتا ہے' نہ ٹال سکتا ہے' وہ جسے چاہے گمراہ کرے' جسے چاہے ہدایت کے راستے پر چلائے' جو کچھ وہ کرتا ہے اس سلسلے میں اس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا' البتہ بندوں سے ان کے ہر عمل کی باز پرس کی جائے گی۔

بندوں کے تمام افعال باری تعالیٰ کی مشیت سے ہیں۔ یہ دعویٰ نقلی دلائل بھی رکھتا ہے اور عقلی دلائل بھی' تمام امت بالاتفاق یہ عقیدہ رکھتی ہے۔

ماشاء اللّٰہ کان ومالم یشاء لم یکن

جو کچھ اللہ نے چاہا ہوا اور جو نہیں چاہا نہیں ہوا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

اَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰہُ لَھَدَی النَّاسَ جَمِیْعًا (پ ۱۳' ر ۱۰' آیت ۳۱)

اگر چاہے اللہ تعالیٰ تو سب لوگوں کو ہدایت دیدے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا کُلَّ نَفْسٍ ھُدٰھَا (پ ۲۱' ر ۱۵' آیت ۱۳)

ہم اگر چاہتے تو ہر نفس کو اس کی ہدایت سے نوازتے۔

اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ معاصی اور برائیوں کو اللہ تعالیٰ برا سمجھتا ہے اور ان کا ارادہ نہیں کرتا۔ بلکہ وہ سب برائیاں اور معاصی اس کے دشمن ابلیس لعین کے ارادے اور خواہش سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ دشمن خدا ہے۔

دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس میں بیشتر شیطان کے ارادے اور خواہش سے ہوتا ہے' کیونکہ نیکیوں کے مقابلے میں برائیاں بہرحال زیادہ ہیں۔ اب ہمیں کوئی یہ بتلائے کہ کوئی مسلمان اپنے رب کو کسی ایسے مرتبے پر کسی طرح بٹھلا سکتا ہے جس پر کسی بستی کا رئیس بھی بیٹھنے کے لئے آمادہ نہ ہو' اور ریاست و اقتدار سے متنفر ہو جائے۔ یعنی یہ منصب کہ بستی میں اس کا کوئی حریف ہو' اور بستی والے اسی حریف کے احکام کی تعمیل زیادہ کرتے ہوں' بیشتر کام اسی کے ارادے اور حکم سے تکمیل پاتے ہوں۔ ہر عزت دار آدمی اس اقتدار کو رسوائی کا باعث سمجھے گا۔ اور اس سے دست بردار ہونے میں عافیت محسوس کرے گا۔ پھر اس سے خدا تعالیٰ کا عاجز اور ضعیف ہونا بھی لازم آتا ہے کیونکہ مخلوق میں نافرمانیاں زیادہ پھیلی ہوئی ہیں اور اہل بدعت کے اعتقاد کے مطابق یہ سب نافرمانیوں کو ختم نہیں کر سکتا۔ پھر جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بندے کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے ہیں تو یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ سب اسی کے ارادے کے پابند ہیں۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے جس فعل کو اللہ چاہتا ہے اس سے منع کیوں کرتا ہے اور جس کا ارادہ نہیں کرتا اس کا حکم کیوں دیتا ہے تو اس کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ امر اور ارادے میں فرق ہے۔ یہ فرق ایک مثال سے واضح ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی آقا اپنے غلام کو مارے اور اس پر تشدد کرے' حاکم وقت آقا کو اس کے رویہ پر برا بھلا کہے تو آقا یہ عذر پیش کرے کہ میں نے اس کو اس کی نافرمانی کی بنا پر زدوکوب کیا ہے۔ حاکم اس کا عذر قبول کرنے سے انکار کر دے اور یہ کہے کہ تو جھوٹ کہتا ہے' یہ غلام تیرا حکم نہیں ٹال سکتا۔ آقا اپنی صداقت ثابت کرنے کیلئے حاکم کے سامنے غلام کو سواری پر زین کسنے کیلئے کہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک امر ہے' لیکن امر کرنے والا (آقا) یہ نہیں چاہتا کہ اس کی تعمیل ہو' اگر یہ امر نہ کرے تو حاکم کے روبرو اس کی صداقت ظاہر نہ ہو' اور اگر غلام سے تعمیل حکم کا ارادہ کرے تو یہ خود اپنے قتل کا ارادہ قرار پائے۔ اور یہ ممکن نہیں کہ آدمی خود اپنے قتل کا ارادہ کرے۔

چوتھی اصل : یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرنے' بندوں کو حکم کرنے اور کرم اور احسان کرنے والا ہے۔ یہ سب کچھ اس پر واجب

نہیں ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ یہ امور اللہ تعالیٰ پر واجب ہیں کیونکہ ان میں بندوں کی فلاح کا راز مضمر ہے۔ معتزلہ کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ ایسا ہونا محال ہے کہ اللہ پر کوئی چیز واجب ہو کیونکہ وہ خود واجب کرنے والا ہے' خود آمر (حکم دینے والا) اور خود ناہی (منع کرنے والا) ہے۔ بھلا وہ کیسے وجوب کا محل بن سکتا ہے۔ اس پر کوئی چیز کیسے لازم ہو سکتی ہے؟

واجب سے دو معنیٰ مراد ہوتے ہیں۔ (۱) وہ فعل جس کے ترک سے اسی وقت' یا آئندہ کسی وقت نقصان لاحق ہو مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ بندے پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت واجب ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اطاعت نہیں کرے گا تو آخرت میں اس پر عذاب نازل ہو گا' یا یہ کہا جائے کہ پیاسے پر پانی پینا واجب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ پانی نہیں پیئے گا تو دم توڑ دے گا۔ (۲) وہ فعل جس کے نہ ہونے سے محال لازم آئے' مثلاً یہ کہا جائے کہ معلوم کا وجود واجب ہے۔ یعنی اگر معلوم نہ ہو تو محال لازم آئے گا۔ اور وہ یہ ہو گا کہ علم جہل ہو جائے گا ــــــ اگر معتزلی حضرات وجوب کے معنیٰ اول مراد لیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ پیدا کرنا اس پر واجب ہے تو یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس صورت میں نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے' اور اگر پیدا کرنا معنیٰ دوم کی رو سے اس پر واجب ہے تو اسے ہم بھی تسلیم کرتے ہیں' اس لیے کہ جب خدا کیلئے علم ازلی ہے تو اس کیلئے معلوم کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ہاں اگر واجب کے وہ کوئی تیسرے معنیٰ بیان کرتے ہیں تو یہ ہمارے فہم سے بالاتر ہے ــــ ان کا یہ کہنا بھی لغو ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کی فلاح کیلئے پیدا کرنا واجب ہے اس لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ بندوں کی بہتری اور انکی فلاح ترک کردے تب بھی اسے کوئی ضرر لاحق نہ ہو۔ پھر وجوب کے کیا معنیٰ باقی رہیں گے؟ کیا یہ ایک بے معنیٰ لفظ رہ جائے گا؟ علاوہ ازیں بندوں کی فلاح تو اس میں تھی کہ انھیں جنت میں پیدا کیا جاتا۔ اس کی خواہش کون عقل مند کریگا کہ اسے دار المصائب میں پیدا کیا جائے' گناہوں کا ہدف بنایا جائے' پھر عذاب اور حساب سے ڈرایا جائے۔

پانچویں اصل : یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے جائز ہے کہ بندوں کو کسی ایسے فعل کا حکم دے جس کی ان میں طاقت نہ ہو۔ اس عقیدے میں معتزلی کی اختلاف کرتے ہیں۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ اگر یہ جائز و ممکن نہ ہوتا تو قرآن پاک میں یہ دعا کیوں بیان کی جاتی۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (پ ۳' ر ۸' آیت ۲)

اے ہمارے رب اور ہم پر ایسا کوئی بار نہ ڈالئے جس کا ہم کو سہار نہ ہو۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی اس کی خبر دی تھی کہ ابو جہل آپ کی تصدیق نہیں کرے گا۔ حالانکہ بعد میں ابو جہل کو اس کا مکلف قرار دیا گیا کہ وہ آپ کی آپ کے تمام اقوال میں تصدیق کرے۔ ان اقوال میں آپ یہ کا یہ قول بھی شامل تھا کہ "ابو جہل میری تصدیق نہیں کرے گا" یہ کیسے ہو سکتا تھا وہ اس کی بھی تصدیق کرتا۔ کیا یہ امر محال کا مکلف بنانا نہیں ہے؟

چھٹی اصل : یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے جائز ہے کہ وہ مخلوق کو کسی سابقہ یا آئندہ جرم کے بغیر عذاب دے' اس عقیدے میں بھی معتزلی اختلاف کرتے ہیں' ہماری دلیل یہ ہیکہ اگر وہ گناہ نہ ہونے کے باوجود کسی کو عذاب دیتا ہے تو اسے اس کا حق ہے' وہ اپنی ملک میں تصرف کرتا ہے۔ اس سے تجاوز نہیں کرتا۔ ظلم یہ ہے کہ کسی دوسرے کی ملک میں اسکی اجازت کے بغیر تصرف کیا جائے۔ اور یہ محال ہے کہ اللہ سے ظلم کا صدور ہو۔ کیونکہ اس کے سامنے کسی دوسرے کی ملک موجود ہی نہیں ہے کہ اس میں تصرف کرنے سے ظالم کہلائے۔ بعض اوقات وہ ایسا حکم دیتا ہے جس سے بظاہر تکلیف سمجھ میں آتی ہے۔ مثلاً جانوروں کا ذبح کرنا' انسانوں کو طرح طرح کے امراض اور تکالیف میں مبتلا کرنا' وغیرہ۔ حالانکہ ان سے کوئی قصور کوئی گناہ پہلے سرزد نہیں ہوا۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ ان جانوروں کو زندہ کرے گا اور جس قدر تکالیف انھوں نے برداشت کی ہیں اس کا بدلہ انھیں عنایت کرے گا تو ہم یہ کہتے ہیں کہ جس شخص کا اعتقاد یہ ہو کہ پامال شدہ چیونٹی اور مسلے ہوئے مچھر کو تکالیف کا اجر دینے کیلئے زندہ کرنا واجب ہے۔

وہ شخص دائرۂ شریعت اور دائرۂ عقل دونوں سے خارج ہے۔ اس لیے کہ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ آپ اس وجوب سے کیا مراد لے رہے ہیں۔ اگر وجوب کے وہ معنیٰ ہیں کہ جس فعل کے ترک سے ضرر لازم آئے تو اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ وجوب محال ہے' ہاں اگر واجب کے دوسرے معنیٰ مراد ہیں تو ہم پہلے ہی یہ لکھ چکے ہیں کہ وہ غیر مفہوم معنیٰ ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ وجوب کا جو معروف مفہوم ہے یہ قول اس دائرے میں نہیں آتا۔

ساتویں اصل : یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے' اس پر یہ واجب نہیں کہ جو بندوں کے حق میں زیادہ مناسب ہو اس کی رعایت کرے' اس لیے کہ خدا تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے بلکہ اس کے حق میں وجوب سمجھ میں ہی نہیں آتا کیونکہ وہ جو کچھ کرتا ہے اس کیلئے جواب دہ نہیں ہے۔ جب کہ مخلوق اپنے ہر عمل کیلئے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

جہاں تک معتزلہ کے اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ خدا تعالیٰ پر بندوں کے حق میں وہی کرنا واجب ہے جو ان کیلئے مناسب تر ہے اس سلسلے میں ہم ذیل کے ایک مفروضہ میں معتزلہ حضرات کی رائے جاننا چاہتے ہیں کہ اگر آخرت میں ایک نابالغ لڑکے' اور ایک مرد کا اجتماع ہو' دونوں مسلمان مرے ہوں۔ اللہ تعالیٰ بالغ کے درجات بڑھائے گا۔ اور لڑکے پر اسے فوقیت عطا کرے گا' کیوں کہ اس نے بلوغ کے بعد اطاعت الٰہی کے لئے محنت مشقت کی تھی' معتزلی حضرات کے بقول ایسا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔ چنانچہ اس صورت میں اگر لڑکا یہ کہے کہ الٰہا! تو نے اسے بلند درجات کیسے عطا کر دیئے؟ اللہ تعالیٰ جواب میں کہیں گے: اس لیے کہ یہ بالغ ہوا اور اس نے میری اطاعت کی۔ اس پر لڑکا یہ جواب دے گا: یا اللہ! مجھے بچپن میں موت دے دی تھی' حالانکہ تجھ پر واجب تھا کہ مجھے زندہ رکھتا تاکہ میں بالغ ہو کر تیری اطاعت کیلئے جدوجہد کرتا' تو نے اس میں انصاف سے کام نہیں لیا۔ اسمیں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ پھر کس لیے بالغ مرد کو میرے مقابلے میں فضیلت دی گئی ہے؟ اللہ تعالیٰ کہیں گے: اس لیے کہ مجھے معلوم تھا کہ تو بالغ ہونے کے بعد شرک یا معصیت کا ارتکاب کریگا۔ تیرے حق میں یہی مناسب تر تھا کہ تو لڑکپن میں مرجائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عذر معتزلی بیان کرتے ہیں لیکن ہم اس مفروضے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ اس لڑکے جواب میں یہ عذر کریں گے تو دوزخ میں سے کافر پکار پکار کر کہیں گے: یا اللہ! تجھے تو معلوم تھا کہ ہم بڑے ہو کر شرک کریں گے۔ تو نے ہمیں بچپن میں ہی کیوں نہ اٹھالیا جبکہ ہمارے حق میں یہی بہتر تھا۔ ہم تو اس مسلمان لڑکے سے کم تر درجات پر بھی راضی تھے۔ معتزلی بتلائیں کہ دوزخیوں کے اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ کیا ارشاد فرمائیں گے؟

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بیشک اللہ بندوں کے حق میں مناسب تر فعل کی رعایت پر قادر ہے' پھر کیوں ان پر عذاب کے اسباب مسلط کئے جاتے ہیں؟ کیا یہ قبیح اور حکمت سے بعید نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قبیح کے معنیٰ ہیں کسی شئی کا غرض کے موافق نہ ہونا۔ اس تعریف کی روشنی میں ایک ہی شئی کسی کے حق میں قبیح ہوتی ہے۔ اور کسی دوسرے کے حق میں اچھی ہوتی ہے بشرطیکہ وہ شئی اس کی غرض سے موافقت بھی رکھتی ہیں' مثلاً کسی شخص کا مارا جانا اس کے اعزہ و اقرباء کے حق میں قبیح ہے۔ جب کہ اس کے دشمن اسے اچھا سمجھتے ہیں۔ اگر معترض کے خیال میں قبیح کے یہاں یہ معنیٰ مراد ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی غرض کے موافق نہیں تو یہ محال ہے۔ اس لیے کہ اللہ کی کوئی غرض ہی نہیں ہے اس لیے اس معنیٰ کے اعتبار سے قبیح کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح اس سے ظلم متصور نہیں اسی طرح قبیح بھی متصور نہیں' ہاں! اگر قبیح کے یہ معنیٰ ہیں کہ دوسروں کے اغراض کے موافق نہ ہو تو اس فعل کو خدا تعالیٰ کے لئے محال کیوں خیال کرتے ہو' جہاں تک عذاب دینے میں حکمت کے فقدان کی بات ہے اس سلسلے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ حکیم کے معنیٰ ہیں کہ وہ اشیاء کی حقیقتوں سے آگاہ ہو' اور ان کے افعال کو اپنے ارادے کے مطابق مضبوط کرنے پر قادر ہو حکیم کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مناسب تر کی رعایت کرے۔ ہمارے زمانے کے حکماء اگر مناسب تر کی رعایت کرتے ہیں تو وہ صرف اپنے نفس کیلئے ایسا کرتے ہیں تاکہ اس کی وجہ سے دنیا میں تعریف و تحسین حاصل ہو' اور آخرت میں ثواب' یا اس کے باعث کوئی آفت ان سے دور ہو جائے۔ اور یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہیں' اس پر مناسب تر رعایت کا

واجب ہونا بھی محال ہے۔

آٹھویں اصل : یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اطاعت اس کے واجب کرنے یا شریعت کی طرف سے واجب کرنے سے واجب ہے۔ معتزلی حضرات اس مسئلے میں بھی اختلاف کرتے ہیں۔ اور اطاعت باری کو عقلاً واجب قرار دیتے ہیں' ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو از روئے عقل واجب قرار دیا جائے تو یہ دو حال سے خالی نہیں ہے' یا تو بے فائدہ واجب کرے گی یا کسی فائدہ کیلئے واجب کرے گی۔ پہلی صورت محال ہے' اس لیے کہ عقل لغویات واجب نہیں کرتی۔ دوسری صورت بھی دو حال سے خالی نہیں ہے' یا تو یہ فائدہ معبود کا ہو گا' یا بندوں کا۔ پہلی صورت محال ہے' کیونکہ معبود حقیقی تمام اغراض و مفادات سے پاک و بے نیاز ہے' بلکہ کفر و ایمان' اور طاعت و نافرمانی سب اس کے حق میں برابر ہیں۔ بندے کا فائدہ بھی محال ہے۔ اسلئے کہ بالفعل بندے کی کوئی غرض اس اطاعت سے وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ اطاعت پر جو محنت وہ کر رہا ہے' اور اسی اطاعت کی وجہ سے وہ اپنی شہوتوں سے باز رہتا ہے' اس کا انجام ثواب و عذاب کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ پھر یہ کہاں سے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ معرفت و اطاعت پر اجر و ثواب ہی عطا کرے گا' عذاب نہیں دے گا۔ حالانکہ اس کے نزدیک اطاعت اور معصیت دونوں برابر ہیں' کیونکہ ان میں سے کسی کی طرف اس کا رجحان نہیں ہے اور نہ کسی کو اس کے ساتھ خصوصیت ہے' معلوم ہوا کہ اطاعت وغیرہ عقل سے واجب نہیں ہوتی' بلکہ ان سب امور کی تمیز شریعت سے پیدا ہوتی ہے۔

کوئی شخص اگر انسانوں پر قیاس کر کے یہ کہنے لگے کہ جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کی شکر گذاری اور جذبۂ اطاعت و اخلاص سے خوشی محسوس کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کو بھی اطاعت سے راحت ہوتی ہے' اور معصیت سے نہیں ہوتی۔ اس کا یہ کہنا ایک غلط قیاس پر مبنی ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جب طاعت و معرفت کا وجوب شریعت کے علاوہ کسی اور چیز سے نہیں ہوتا۔ اور شریعت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ مکلف اس میں نظر نہ کرے' اس صورت میں اگر مکلف شخص پیغمبر سے یہ کہے کہ عقل مجھ پر نظر واجب نہیں کرتی' اور شریعت بغیر نظر کے حاصل نہیں ہوتی کہ مجھ پر اثر انداز ہو' اور میں خود شریعت میں نظر کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہیئے کہ وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس شخص کا یہ کہنا ایسا ہے جیسے زید عمرو سے یہ کہے کہ تیرے پیچھے ایک درندہ کھڑا ہوا ہے' اگر تو یہاں سے نہیں گیا تو وہ تجھے ہلاک کر دے گا' تجھے میرے قول کی سچائی اس وقت معلوم ہو گی جب تو پیچھے مڑ کر دیکھے گا' اس کے جواب میں عمرو کہے کہ تیری صداقت اس وقت تک ثابت نہیں ہو گی جب تک کہ میں پیچھے مڑ کر نہ دیکھوں اور جب تک تیرا سچ ظاہر نہ ہو جائے کیا ضروری ہے کہ میں مڑ کر دیکھوں' ظاہر ہے کہ عمرو کا یہ جواب حماقت پر مبنی ہو گا۔ خود ہلاک ہو گا۔ زید کا اس میں کیا نقصان ہے؟ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تمہارے پیچھے موت ہے' اور اے لوگو! میرے قول کی سچائی میرے معجزوں پر نظر کرنے سے معلوم ہو گی۔ جو شخص میرے معجزوں پر نظر کرے گا وہ اپنے آپ کو بچالے گا' اور جو انہیں نظر انداز کرے گا' اور اپنی غلطیوں پر مصر رہے گا وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اگر سب لوگ ہلاک ہو جائیں تو اس میں میرا کوئی نقصان نہیں۔ میری ذمہ داری تو صرف یہ ہے کہ صاف صاف کہہ دوں' شریعت یہ بتلاتی ہے کہ موت کے بعد درندوں سے سابقہ پڑ سکتا ہے' اور عقل یہ بتلاتی ہے کہ شریعت کو سمجھ کر' اور اس کے مطابق عمل کر کے ان درندوں سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ عقل طبیعت کو ضرر سے بچنے پر ابھارتی ہے' اور یہ بتلاتی ہے کہ واجب کے معنیٰ ہی یہ ہیں کہ اس کے ترک سے ضرر لازم آئے۔

شریعت کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ واجب کرنے والی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت اس ضرر کی نشاندہی کرتی ہے جو آئندہ متوقع ہے کیونکہ عقل اس کی رہنمائی نہیں کرتی کہ شہوات کی پیروی کرنے سے موت کی بعد ضرر کا نشانہ بننا پڑے گا۔ یہ معنیٰ ہیں شریعت اور عقل کے' اور وجوب کے باب میں ان دونوں کی تاثیر کے' اگر بالفرض مامور بہ کے ترک پر عذاب کا خوف نہ ہوتا تو

وجوب بھی ثابت نہ ہوتا اس لیے کہ واجب تو اسی کو کہتے ہیں جس کے ترک کرنے سے آخرت میں کوئی نقصان لازم آئے۔

نویں اصل : یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت محال نہیں ہے' اس سلسلے میں فرقہ براہمہ کا اختلاف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عقل کی موجودگی میں رسولوں کے بھیجنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ عقل سے وہ باتیں معلوم نہیں ہوتیں جو آخرت میں نجات کا باعث ہوں' جس طرح عقل سے وہ دوائیں معلوم نہیں ہوتیں جو صحت کیلئے مفید ہوں۔ اس لیے کہ مخلوق کو انبیاء کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسے مریضوں کو اطباء کی ضرورت ہوتی ہے' فرق صرف اتنا ہے کہ طبیب کا قول تجربے سے سچ مانا جاتا ہے اور نبی کا معجزے سے۔

دسویں اصل : یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین اور پچھلی شریعتوں یعنی یہودیت نصرانیت اور مجوسیت کا ناسخ بنا کر مبعوث فرمایا اور روشن معجزات و کرامات سے آپ کی تائید فرمائی۔ جیسے چاند کا شق ہونا۔ کنکریوں کا تسبیح پڑھنا' چوپائے کا بولنا' اور انگلیوں کے درمیان سے پانی کا بہنا وغیرہ۔ آپ کو ان معجزات کی بنا پر تمام عرب پر تفوق حاصل ہوا۔ اور وہ لوگ اپنی فصاحت و بلاغت کے باوجود قرآن کا مقابلہ نہ کر سکے' اس لیے کہ جو کچھ حسن بیان' حسن ترتیب' اور حسن عبارت اس میں ہے' انسان کی طاقت میں نہیں کہ وہ اپنے کلام میں ان خوبیوں کو جمع کر سکے' عربوں نے آپ سے مناظرے کئے' آپ کو گرفتار کیا' لوٹا' آپ کے قتل کا ارادہ کیا' جلا وطن کیا مگر قرآن کا جواب نہ لا سکے' حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی (ناخواندہ) تھے' آپکو کتابوں سے کوئی واسطہ نہ تھا' لیکن اس کے باوجود انھوں نے پچھلے لوگوں کے حالات و واقعات بیان فرمائے' اور آنے والے واقعات سے متعلق پیشین گوئیاں کیں۔ جن کی صداقت ظاہر ہوتی۔ مثلاً یہ آیت:

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ

(پ۲۶' ر۱۲' آیت ۲۷)

تم لوگ مسجد حرام (مکہ) میں ضرور جاؤ گے انشاء اللہ امن و امان کے ساتھ کہ تم میں کوئی سر منڈاتا ہوگا اور کوئی بال کترواتا ہوگا۔

یا یہ آیت کریمہ جس میں روم پر غلبے کی پیشین گوئی کی گئی ہے:

الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ (پ۲۱' ر۴' آیت ۱-۴)

الم' اہل روم ایک قریب کے موقع میں مغلوب ہو گئے اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب تین سال سے لیکر نو سال تک کے اندر اندر غالب آجائیں گے۔

معجزہ رسول کے سچا ہونے پر دلالت کرتا ہے' اس کی وجہ ہے کہ جس فعل سے انسان عاجز ہو اسے خدا کے علاوہ کوئی انجام نہیں دے سکتا' جب اس طرح کا فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ظاہر ہوگا تو اس کے یہ معنیٰ ہونگے کہ گویا اللہ یہ فرماتا ہے کہ رسول سچ کہتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص بادشاہ کے سامنے حاضر ہو' اور اس کی رعایا کے سامنے یہ دعویٰ کرتا ہو کہ میں بادشاہ کا ایلچی ہوں۔ وہ اپنی صداقت ثابت کرنے کیلئے بادشاہ سے درخواست کرے کہ آپ میرے کہنے پر اپنے تخت سے تین مرتبہ اٹھیں اور تین مرتبہ بیٹھیں' بادشاہ اس کے کہنے پر یہی کرے۔ اس صورت میں وہاں جتنے افراد موجود ہونگے سب سمجھ جائیں گے کہ گویا بادشاہ نے اسکی صداقت پر اپنی مہر ثابت کر دی ہے۔

چوتھا رکن : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی تصدیق۔ یہ رکن بھی دس اصولوں پر مشتمل ہے۔

پہلی اصل : یہ ہے کہ حشر و نشر ہوگا۔ شریعت اس کی خبر آچکی ہے۔ (۱) حشر و نشر کی تصدیق کرنا واجب ہے' عقلاً بھی اس کا وجود ممکن ہے۔ حشر و نشر کے معنی یہ ہیں کہ فنا کے بعد دوبارہ پیدا کیا جائے گا۔ اور یہ خدا کی قدرت میں داخل ہے۔ جس طرح اس نے پہلے پیدا کیا ہے اسی طرح وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے' قرآن پاک میں ہے:۔

قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ

(پ ۲۳' ر ۴' آیت ۷۸)

کہتا ہے کہ ہڈیوں کو جب وہ بوسیدہ ہو گئی ہوں کون زندہ کرے گا۔ آپ جواب دیجئے کہ ان کو وہ زندہ کرے گا' جس نے اول مرتبہ میں انہیں پیدا کیا۔

اس آیت میں پہلی مرتبہ پیدا کرنے سے دوسری مرتبہ پیدا کرنے پر استدلال فرمایا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا:۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ (پ ۲۱' ر ۲۱' آیت ۲۸)

تم سب کا پیدا کرنا اور زندہ کرنا بس ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک شخص کا۔

دوبارہ پیدا کرنا دوسری ابتداء ہے' اس لیے وہ بھی ابتدائے اول کی طرح ممکن ہے۔

دوسری اصل : منکر نکیر کی تصدیق بھی ضروری ہے' احادیث میں آچکا ہے کہ وہ سوال و جواب کریں گے۔ (۲) منکر نکیر کا سوال بھی از روئے عقل ممکن ہے۔ اس لیے کہ اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ دوبارہ زندگی میں بھی وہی اجزاء واپس آئیں جن سے خطاب سمجھا جا سکے اور یہ امر بذات خود ممکن ہے۔ اس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ میت کے اجزاء ساکن رہتے ہیں' یا ہم منکر نکیر کا سوال نہیں سن پاتے' ہم یہ کہتے ہیں کہ میت کو سوئے ہوئے شخص پر قیاس کر لو' ظاہر میں وہ بھی ساکن رہتا ہے لیکن باطن لذتیں پاتا ہے' تکالیف محسوس کرتا ہے' حتیٰ کہ بعض اوقات جاگنے کے بعد بھی ان کے اثرات محسوس کرتا ہے۔ (۳) روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبرئیل علیہ السلام کا کلام سنتے تھے' ان کو دیکھتے تھے' لیکن آپ کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ ان کا کلام سننے اور انھیں دیکھنے سے محروم رہتے تھے' اور نہ ان سے کچھ دریافت کر سکتے تھے' الا ماشاء اللہ۔ کیونکہ ان لوگوں میں فرشتوں کو دیکھنے اور انھیں سننے کی صلاحیت پیدا نہیں کی گئی تھی اس لیے وہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھی نہیں دیکھ پاتے تھے۔

تیسری اصل : عذاب قبر بھی شریعت سے ثابت ہے۔ (۴) قرآن پاک میں ہے:۔

النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ (پ ۲۴' ر ۱۰' آیت ۴۶)

وہ لوگ صبح و شام آگ کے سامنے لائے جاتے ہیں اور جس روز قیامت ہوگی (حکم ہوگا) فرعون والوں کو (مع

---

(۱) یہ حدیث ابن عباسؓ' عائشہؓ اور ابو ہریرہؓ سے بخاری و مسلم میں منقول ہے۔ ابن عباسؓ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں انکم لمحشورون الی اللہ۔ عائشہؓ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ یحشرون یوم القیامۃ حفاۃ ابو ہریرہؓ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔ یحشر الناس علی ثلاث طرائق۔ (۲) یہ روایات کتاب العقائد کے پہلے باب میں گذر چکی ہے۔ (۳) بخاری و مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایات کے الفاظ یہ ہیں : قالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوما یا عائشۃ ھذا جبرئیل یقرئک السلام فقلت وعلیہ السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ تری ما لا اری۔ الا ماشاء اللہ امام غزالیؒ نے اسی لیے کہا کہ اکثر لوگوں نے جبرئیلؑ کو نہیں دیکھا تاہم بعض صحابہ کرامؓ مثلاً عمرؓ' عبداللہ بن عمرؓ اور کعب بن مالکؓ نے حضرت جبرئیلؑ کو دیکھا بھی ہے۔ (۴) عذاب قبر سے متعلق حدیث کتاب العقائد کے باب اول میں گذر چکی ہے۔

فرعون کے) سخت عذاب میں داخل کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور تمام سلف صالحین سے بتواتر منقول ہے کہ وہ عذاب قبر سے پناہ مانگا کرتے ہیں۔(۱) قبر کا عذاب ممکن ہے۔ اس کی تصدیق واجب ہے' میت کے اجزاء کا درندوں کے پیٹ میں اور پرندوں کے پوٹوں میں منتقل ہو جانا عذاب قبر کی تصدیق کا مانع نہیں ہے' عذاب کی تکلیف کا احساس حیوان کے چند مخصوص اجزاء کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ وہ ان اجزاء میں احساس اور ادراک کی قوت دوبارہ پیدا کردے۔

چوتھی اصل : میزان ہے۔ میزان کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ (پ ۱۷' ر ۴' آیت ۴۷)

اور قیامت کے روز ہم میزان عدل قائم کریں گے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا:

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ (پ ۱۸' ر ۶' آیت ۱۰۲-۱۰۳)

سو جس شخص کا پلہ (ایمان) کا بھاری ہوگا تو ایسے لوگ کامیاب ہونگے' اور جس شخص کا پلہ ہلکا ہوگا سو یہ وہ لوگ ہونگے جنھوں نے اپنا نقصان کرلیا' اور جہنم میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ کے یہاں جس مرتبے کا جو عمل ہوتا ہے اسی قدر اس کے نامۂ اعمال میں وزن پیدا کردیتا ہے' اسی سے بندوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ کس بندے کے کس عمل میں کتنا وزن ہے' اسی سے یہ امر بھی منکشف ہوگا کہ وہ عذاب دے تو یہ اس کا انصاف اور عدل ہے' اور اگر ثواب دے تو یہ عفو و فضل ہے۔

پانچویں اصل : پُل صراط ہے پُل صراط دوزخ کی پشت پر بنا ہوا ہے' بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ (پ ۲۳' ر ۶' آیت ۲۳-۲۴)

پھر ان سب کو دوزخ کا راستہ بتلاؤ' اور (اچھا) ان کو (ذرا) ٹھہراؤ ان سے کچھ پوچھا جائے گا۔

پُل صراط کا ہونا بھی ممکن ہے' اس لیے اس کی تصدیق بھی واجب ہے' اس کے ممکن ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جو ذات اس پر قادر ہے کہ پرندے کو ہوا میں اڑائے وہ ذات انسان کو پُل صراط پر چلانے کی قدرت بھی رکھتی ہے۔

چھٹی اصل : یہ ہے کہ جنت اور دوزخ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (پ ۴' ر ۵' آیت ۱۳۳)

اور دوڑو مغفرت کی طرف جو تمہارے پروردگار کی جانب سے ہے اور جنت کی طرف جس کی وسعت ایسی ہے جیسی آسمانوں اور زمین کی' وہ تیار کی گئی خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔

لفظ اُعِدَّتْ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت مخلوق ہے' اسی لیے اس کو ظاہر لفظ کے اعتبار سے رہنے دینا واجب ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی محال نہیں ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ روز جزا سے پہلے ان دونوں کو پیدا کرنے میں بظاہر کوئی فائدہ نہیں تو اس کا جواب ہے کہ

---

(۱) عذاب قبر سے پناہ مانگنے کی روایت بخاری و مسلم میں ابو ہریرہؓ سے منقول ہے۔

یہ خدا کا فعل ہے' اور جو کچھ خدا کرتا ہے اس میں اس سے کوئی باز پرس نہیں کی جا سکتی۔

ساتویں اصل : یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ائمہ برحق بالترتیب یہ ہیں' حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان' اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی امام کے سلسلے میں کوئی نص قطعی وارد نہیں ہے اگر اس خصوص میں کوئی نص موجود ہوتی تو اس کا ضرور علم ہوتا۔ آپ نے اپنی زندگی میں مختلف علاقوں میں جن صحابہؓ کو مختلف مناصب پر مامور فرمایا تھا وہ ظاہر تھے۔ یہ امر تو ان کی بہ نسبت زیادہ واضح ہونا چاہیئے تھا۔ پھر کیسے پوشیدہ رہا اور اگر ظاہر ہوا تو باقی کیوں نہیں رہا۔ اور ہم تک کیوں نہیں پہنچا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ لوگوں کے پسند کرنے' اور ان کے دست حق پر بیعت کرنے سے خلیفہ مقرر ہوئے۔ بالفرض اگر یہ کہا جائے کہ نص حضرت ابوبکرؓ کیلئے نہیں تھی' بلکہ دوسرے صحابی کے لئے تھی تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ الزام تو تمام اصحاب رسولؐ کے سر آتا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کی مخالفت کی' اور اجماع کے خلاف کیا۔ یہ الزام صرف روافض ہی لگا سکتے ہیں' ان کے علاوہ کوئی دوسرا اس طرح کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اہل سنت کا اعتقاد یہ ہے کہ سب صحابہؓ کو اچھا کہیں اور جس طرح کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف کی ہے اسی طرح ہم بھی ان کی تعریف کریں۔

حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ میں جو اختلاف ہوئے وہ اجتہاد پر مبنی تھے۔ یہ وجہ نہیں تھی کہ حضرت امیر معاویہؓ امامت کے خواہشمند تھے۔ بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت علیؓ نے یہ خیال کیا کہ حضرت عثمان غنیؓ کے قاتلوں کو سپرد کر دینے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ امامت کا معاملہ درہم برہم ہو جائے گا' اس لیے کہ ان کا بہت سے بڑے قبائل سے تعلق ہے' اور فوج میں بھی ان کی بڑی تعداد ہے۔ ان کے خیال میں تاخیر بہتر تھی۔ حضرت معاویہؓ قاتلوں کی سزا میں تاخیر کے خلاف تھے' ان کا خیال تھا کہ اتنے بڑے قصور کے بعد اس قدر تاخیر سے کام لینے کا مطلب ہے کہ آئندہ بھی لوگ ائمہ کے مقابلے میں جری رہیں اور ناحق کشت و خون ہوتا رہے۔ اکابر علماء کہتے ہیں کہ ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے اور بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ صواب کے پہنچنے والا مجتہد ایک ہی ہوتا ہے۔ کسی بھی عالم نے یہ نہیں کہا کہ حضرت علیؓ غلطی پر تھے۔

آٹھویں اصل : یہ ہے کہ صحابہؓ کی فضیلت اسی ترتیب سے ہے جس طرح پر خلافت ہوئی' اس لیے کہ فضل حقیقت میں وہ ہے جو اللہ کے یہاں بھی فضل ہو اور یہ معاملہ ایسا تھا کہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی دوسرا واقف نہ ہوتا۔ لیکن کیونکہ ان سب کی فضیلت میں احادیث اور آیات کثرت سے وارد ہیں۔ اس لیے وہ لوگ فضیلت کے درجات اور اہل فضل کی ترتیب سے بخوبی واقف نہ ہوتے تو خلافت کو اس طرح ترتیب نہ دیتے' وہ ایسے لوگ تھے کہ اللہ کے معاملے میں ملامت اور طعن و تشنیع سے انھیں کوئی خوف نہیں تھا۔ اور نہ کوئی مانع ان کیلئے ایسا تھا جو امر حق سے انھیں باز رکھے۔

نویں اصل : یہ ہے کہ اسلام' بلوغ' عقل اور حریت (آزاد ہونا) کے بعد امارت کی پانچ شرائط اور بھی ہیں اور وہ یہ ہیں مرد ہونا' ورع' علم' اہلیت' اور قریشی ہونا۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

الائمۃ من قریش (نسائی)

امام قریش سے ہوتے ہیں۔

اگر بہت سے لوگ ایسے ہوں جن میں یہ شرائط پائی جاتیں تو امام وہ شخص ہوگا جس کے ہاتھ اکثر لوگ بیعت کر لیں اور جو اکثریت کے فیصلے سے اختلاف کرے وہ باغی ہے' اسے اطاعت حق کی طرف واپس لانا واجب ہے۔

دسویں اصل : یہ کہ اگر کوئی شخص منصب امامت پر فائز ہو اور اس میں ورع اور علم کی صفات موجود نہ ہوں لیکن اسے معزول کر دینے میں کسی ایسے فتنے کا اندیشہ ہو جس کے لوگ متحمل نہ ہو سکیں تو ہم یہی کہیں گے کہ اس کی امامت درست ہے۔ اس

لیے کہ اگر اسے اس کے منصب سے معزول کردیا جائے تو دو حال سے خالی نہیں یا دوسرا اس کی جگہ پر ہو یا منصب امامت بالکل خالی رہے۔ اگر اس منصب پر کسی دوسرے کا تقرر کیا جائے تو فتنے کا اندیشہ رہے گا' اور اس فتنے کا ضرر اس ضرر کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوگا جو مذکورہ امام میں امامت کی بعض شرائط نہ پائے جانے سے لاحق ہوتا ہے' مذکورہ شرائط صرف مصالح کی زیادتی کیلئے وضع کی گئیں ہیں۔ مصالح کے زیادہ نہ ہونے کے خوف سے اصل مصالح کو برباد کرنا بہتر نہیں ہے۔ یہ ایسا ہے کہ جیسے کوئی ایک محل تعمیر کرے اور پورے شہر کو کھنڈرات میں تبدیل کردے۔ دوسری صورت بھی بہتر نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر شہر میں کوئی امام نہ ہو تو تمام مقتدات بگڑ جائیں گے۔ اور نظم خراب ہو جائے گا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ باغیوں کا فیصلہ ان کے زیر قبضہ شہر میں قابل تنفیذ ہے محض اسلئے کہ اہل شہر کو حکومت کی ضرورت ہے تو کیا ان ائمہ کے فیصلے قابل تنفیذ نہیں ہونگے؟

یہ چار ارکان ہیں جو چالیس اصولوں پر مشتمل ہیں۔ یہ عقائد کے قواعد ہیں' جو ان کا اعتقاد رکھے گا وہ اہل سنت والجماعت میں شمار کیا جائے گا' اور اہل بدعت سے علیحدہ سمجھا جائے گا۔۔۔۔۔۔ ہم اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ وہ اپنی توفیق سے ہمیں راہ ہدایت پر ثابت قدم رکھے اور اپنے جود و کرم اور فضل و احسان سے نوازے۔

"وصلی اللہ سیدنا و مولانا محمد وآلہ وصحبہ وبارک وسلم"

"چوتھا باب"

ایمان و اسلام

ایمان اور اسلام کی حقیقت : اس مسئلے میں علماء کا اختلاف ہے کہ اسلام اور ایمان دونوں ایک ہیں' یا الگ الگ۔ اگر دونوں ایک ہیں تو کیا اسلام ایمان سے الگ پایا جاتا ہے یا ایمان کا متعلق اور لازم ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ دونوں ایک ہی ہیں اور بعض یہ کہتے ہیں کہ دو ہیں اور دونوں الگ الگ پائے جاتے ہیں۔ کچھ حضرات یہ کہتے ہیں کہ دونوں دو ہیں تاہم ایک دوسرے سے وابستہ رہتے ہیں۔ ابو طالب مکیؒ نے اس مسئلے میں ایک طویل اور گنجلک تحریر لکھی ہے۔ اب ہم اس طرح کی بے فائدہ تقریر نقل کئے بغیر واضح اور صریح حق بیان کرتے ہیں۔

اس مسئلے میں تین بحثیں ہیں۔ اول : لغت میں ان دونوں کا کیا مفہوم ہے؟ دوم : شرع میں ان دونوں سے کیا مراد ہے؟ سوم : دنیا اور آخرت میں ان دونوں کے کیا احکامات ہیں؟ پہلی بحث لغوی ہے' دوسری تفسیری' تیسری فقہی اور شرعی۔

ایمان و اسلام کے لغوی معنیٰ : اس سلسلے میں حق بات یہ ہے کہ ایمان تصدیق کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

وما انت بمؤمن لنا (پ ۱۲' ر ۱۲' آیت ۱۷)

اور آپ ہماری تصدیق کرنے والے نہیں ہیں۔

آیت میں مؤمن سے مراد ہے مصدق یعنی تصدیق کرنے والا۔ اور اسلام کے معنیٰ ہیں حکم بجالانا' سرکشی' انکار اور عناد چھوڑنا۔ تصدیق کا ایک خاص محل ہے جسے دل کہتے ہیں۔ دل سے تصدیق ہوتی ہے زبان اس کی ترجمان ہے' تسلیم عام ہے' اس کا تعلق دل' زبان اور اعضاء تینوں سے ہے کیونکہ تصدیق دل سے ہے' وہی تسلیم ہے اور ترک تصدیق انکار ہے۔ زبان سے اقرار کیا جاتا ہے اور اعضاء سے اطاعت کی جاتی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اسلام عام ہے اور ایمان خاص ہے۔ اسلام کے اجزاء میں اشرف ترین جزء کا نام ایمان ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر تصدیق تسلیم ہے' ہر تسلیم تصدیق نہیں ہے۔

ایمان و اسلام کے شرعی معنیٰ : شریعت میں ان دونوں کا اطلاق تینوں طرح ہوا ہے یعنی یہ کہ دونوں ایک ہیں' یا دونوں جدا